مارچ ۲۰۰۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سیمینار: **پاک ' بھارت تعلقات**

امکانات' توقعات اور خدشات

جس میں ملک کے ممتاز سکالرز' صحافی اور وکلاء حضرات نے شرکت کی

صدارت: **ڈاکٹر اسرار احمد**

﴿ مقررین ﴾

- جنرل (ر) حمید گل
- مرزا ایوب بیگ
- مشاہد حسین سید
- عطاالحق قاسمی
- ایس۔ ایم۔ ظفر

اس سیمینار کی کاروائی VCDs میں دستیاب ہے

تعداد سی ڈیز: 3 قیمت: 120/=

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن**

36 کے ماڈل ٹاؤن' لاہور۔ فون: 03-5869501

www.tanzeem.org

e-mail: info@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد: 53

شمارہ: 3

محرم الحرام 1425ھ

مارچ 2004ء

فی شمارہ 15/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت

حافظ عاکف سعید

سید قاسم محمود

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 150روپے
- ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 800روپے
- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1000روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700' فون 03-5869501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو علامہ اقبال روڈ' لاہور

فون: 6316638-636638 فیکس: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ______ 3

سید قاسم محمود

☆ ظروف و احوال ______ 5

ملکی و ملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہار رائے

☆ منتخب نصاب۔۲ ______ 9

امراء کا اپنے رُفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اُسوۂ رسول ﷺ

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ پاک بھارت تعلقات ______ 31

ہندو مسلم منافرت کی تاریخ اور اسباب' اور مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل

- تقسیم ہند: برطانوی منصوبہ یا الٰہی تدبیر؟
اور پاک بھارت کشیدگی: انگریز کی گھناؤنی سازش
- پاکستان کا قیام: برطانوی سازش یا خدائی تدبیر؟
- پاک بھارت کشیدگی: انگریز کی گھناؤنی سازش
- پاک بھارت مفاہمت اور مسئلہ کشمیر کا حل
- ضمیمہ بابت مسئلہ کشمیر اور اس کا حل

☆ تذکیر و موعظت ______ 77

تزکیہ نفس

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

☆ ایمانیات ______ 83

شرک کی برائیاں اور نقصان

حافظ محمد سلیمان

☆ دنیائے اسلام ______ 86

الجزائر (۳)

سید قاسم محمود

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

پاکستان اور بھارت نے بالآخر باہمی مفاہمت کی ضرورت محسوس کر لی ہے' اور تازہ اطلاعات کے مطابق پاک بھارت ''مربوط مذاکرات'' ماہ رواں میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والے ہیں۔ غیر ملکی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ۵۶ برس دونوں ملکوں کی باہمی مخاصمت وعداوت میں گزر گئے ہیں۔ اچھے پڑوسیوں کے سے خوشگوار تعلقات کی راہ میں بہت سے حقیقی عوامل اور نفسیاتی حجابات حائل رہے ہیں' لیکن بلاشبہ کشمیر کا تنازعہ اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ گزشتہ ماہ اسلام آباد میں ''سارک کانفرنس'' کے موقع پر دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے باہمی مفاہمت کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مسئلے پر بھی مربوط مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ مذاکرات پہلے بھی کئی بار ہو چکے ہیں' لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہمیشہ یہ سوال حائل رہا کہ مفاہمت ہو تو کیونکر ہو اور کشمیر کا مسئلہ حل ہو تو کیونکر ہو؟ اور اب بھی یہ سوال جوں کا توں موجود ہے۔

اس اہم اور بنیادی سوال کا قابل عمل اور حقیقت پسندانہ حل ''تنظیم اسلامی'' کے بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے آج سے دس سال قبل دانشور دانیال لطیفی صاحب کی ایک تحریر کے جواب میں' ایک طویل مضمون کی صورت میں پیش کر دیا تھا جو روزنامہ ''جنگ'' لاہور کی اشاعت ۲۲/اپریل ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر ایک تنقیدی تحریر دو قسطوں میں پروفیسر محمد یوسف عرفانی صاحب نے روزنامہ ''جنگ'' کی اشاعت بابت ۱۶ اور ۱۷ مئی ۱۹۹۴ء میں چھپوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تنقید کا جواب' نئے دلائل کے ساتھ دیا۔ ان مضامین میں جو موضوعات زیر بحث آئے تھے' وہ استفہام کی بھی حیثیت رکھتے تھے اور استدلال کی بھی' مثلاً یہ کہ ''تقسیم ہند برطانوی منصوبے کا نتیجہ ہے یا الٰہی تدبیر؟'' یہ کہ پاک بھارت تعلقات میں جو کشیدگی روزِ اوّل سے موجود ہے' وہ انگریز کی گھناؤنی سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ کہ پاک بھارت مفاہمت کیوں ضروری ہے۔ یہ کہ مسئلہ کشمیر کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ مضامین ماہنامہ ''میثاق'' کے شمارہ جولائی ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئے تھے۔

اب پاکستان اور بھارت کے مابین باہمی مفاہمت و مصالحت اور مسئلہ کشمیر کے حل پر بھی ''مربوط مذاکرات'' ہونے والے ہیں' اور یہ کہ یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں' آئندہ بھی ہوتے رہیں گے' لہٰذا ضروری محسوس ہوا کہ دس سال پہلے دونوں پڑوسی ملکوں میں مفاہمت و مصالحت اور مسئلہ کشمیر کے مجوزہ حل پر مشتمل محترم ڈاکٹر صاحب کی دس سال پرانی ان تحریروں کو ''میثاق'' کے صفحات میں دوبارہ یکجا کر کے شائع کیا جائے۔ نیز ۱۹۹۴ء کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب اپنی پریس کانفرنسوں میں جو بیانات اس سلسلے میں دیتے رہے ہیں' وہ بھی اختصار کے ساتھ بطور ''ضمیمہ'' شامل کر لئے جائیں۔ چنانچہ زیرنظر شمارے میں ''ہندو مسلم منافرت کی تاریخ اور اسباب کا تجزیہ' اس کے ازالے کی اہمیت' اور پاکستان اور بھارت کے مابین مسلسل جنگ کے سب سے بڑے سبب' یعنی مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل'' کے جامع عنوان کے تحت محترم ڈاکٹر صاحب کی چند تحریریں اور بیانات یکجا کر کے شائع کئے جا رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ایک اسلامی انقلابی جماعت کے مطلوبہ اوصاف اور تنظیمی مسائل کے ضمن میں ہدایات پر مشتمل مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب نمبر۲ کے دروس کا سلسلہ گزشتہ سال جنوری کے شمارے سے شروع کیا گیا تھا۔ زیرنظر شمارے میں اس سلسلہ کا درس ۱۰ بعنوان ''امراء کا اپنے رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اسوۂ رسول ﷺ'' شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

دنیائے اسلام کے تعارف پر مشتمل سلسلہ مضامین میں چھ برادر اسلامی ممالک کا تعارف مکمل ہو گیا ہے۔ الجزائر کی تاریخ' اس کی تحریک آزادی اور موجودہ سیاسی حالات کی اہمیت کے پیش نظر اس کا تعارف قدرے تفصیل کا متقاضی تھا' لہٰذا یہ تین شماروں پر محیط ہو گیا ہے۔ آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ ''انڈونیشیا'' پر مضمون شائع کیا جائے گا۔

سالِ رواں کے آغاز سے ''میثاق'' کے صفحات میں اضافے کے بعد مجلس ادارت کی یہ بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ پرچے میں مضامین کی تعداد اور تنوع میں اضافہ کیا جائے۔ ہم اس کوشش میں کس حد کامیاب ہوئے ہیں' اس کا فیصلہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ اس ضمن میں قارئین کی آراء اور تجاویز کا انتظار ہے۔ ○○

ملکی و ملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہارِ رائے

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاباتِ جمعہ کے آئینہ میں

(۱)

''اپنی قومی زندگی کے موسمِ خزاں میں جشنِ بہاراں منانا لمحہ فکریہ ہے!''

۱۳ر فروری ۲۰۰۴ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

زندگی کے کسی بھی گوشے میں اللہ کی بجائے کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم کرنا فتنے کو جنم دیتا ہے۔ آج پوری دنیا مادہ پرستی کے جس سیلاب میں بہہ رہی ہے وہ دجالی فتنہ ہی کی ایک صورت ہے۔ حدیث نبوی کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا جب کسی مسلمان کے لئے اپنے ایمان پر کاربند رہنا اتنا ہی مشکل ہو جائے گا جیسا کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر دہکتے ہوئے انگارے کو برداشت کرنا۔ ایسے حالات میں صرف وہی لوگ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے پر یقین رکھتے ہوں اور اسباب و وسائل پر بھروسہ کرنے کی بجائے اللہ کی ذات پر توکل کرنے والے ہوں۔ آج کے مادہ پرستانہ دور میں ایمان کے اس معیار پر پورا اترنا آسان نہیں ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید میں اصحاب کہف کا واقعہ خاص طور پر غور و فکر کے لائق ہے۔ اللہ کو ماننے والے چند نوجوان اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ایک جابر بادشاہ کے سامنے اپنے ایمان پر ڈٹ گئے تو اللہ نے ان کی مدد کا کیسا سامان فراہم کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا صلبی بیٹا قرار دے کر پال نے عیسائیت کی شکل مسخ کر دی جس کے نتیجے میں آج کی پوری تہذیب جس کا امام مغرب ہے مذہب سے بالکل عاری اور اللہ سے باغی ہو چکی ہے۔ اگرچہ مغرب نے مادی اسباب اور دنیاوی آسائشوں کے حصول میں بہت زیادہ ترقی کر لی ہے لیکن اس تہذیب کا جسد روح سے خالی ہے۔ گویا دجال کی مانند یہ تہذیب بھی صرف ایک ہی آنکھ رکھتی ہے۔ توحید اور انسانی زندگی کے روحانی و معاشرتی پہلوؤں سے اس یک چشمی تہذیب کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

ان حالات میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہم اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ کر دجالیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ امت مسلمہ پر جو

آزمائشیں یکے بعد دیگرے آ رہی ہیں ان سب سے نبٹنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم اللہ کے حکم پر چلیں اور اس کے دامن کو تھام لیں۔ اپنی قومی زندگی کے موسم خزاں سے گزرتے ہوئے سرکاری سرپرستی میں جشن بہاراں منانا ہمیں قطعاً زیب نہیں دیتا۔ آج پوری قوم جس شدید قسم کی مایوسی' بددلی اور ذہنی اضطراب کا شکار ہے اس سے نکلنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اجتماعی توبہ کی طرف متوجہ ہوں اور نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ اس سے آگے بڑھ کر معاشرے اور ملکی سطح پر شریعت کے نفاذ کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ امریکہ اور اسلام دشمن عالمی طاقتوں کے مقابلے میں کائنات کی عظیم ترین طاقت یعنی اللہ تعالیٰ کے مدد کے حصول کا یہی واحد راستہ ہے۔

(۲)

''اسلام دشمن عالمی طاقتوں کا اصل ہدف ہمارا ایٹمی پروگرام ہے''

۶ر فروری ۲۰۰۴ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

ڈاکٹر عبدالقدیر کے اعتراف کے بعد صدر مشرف کا یہ کہنا کہ حکومت پر کوئی دباؤ نہیں ہے اور بعض ایٹمی سائنس دانوں کی ''قربانی'' دینے کے بعد ہمارا ایٹمی پروگرام آئندہ بھی آسانی سے چلتا رہے گا' عوام کو لوریاں دے کر سلانے اور خود فریبی میں مبتلا ہونے کے مترادف ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسلام دشمن عالمی طاقتوں کا اصل ہدف ہمارا ایٹمی پروگرام ہے۔ امریکہ اس پر اپنا کنٹرول چاہتا ہے اور وہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد ہم نے جب سے امریکہ کا تابع مہمل بننا قبول کیا ہے' امریکہ کے بے پناہ دباؤ کے تحت ہی ہم نے اپنے قومی مفادات اور اصولوں کی یکے بعد دیگرے قربانی دی ہے۔ چنانچہ افغانستان کی اسلامی حکومت کے خلاف امریکہ کی مدد' قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن' مسئلہ کشمیر پر یوٹرن اور ایٹمی سائنس دانوں کی تذلیل جیسے معاملات کے باعث آج پوری قوم سوگوار ہے' لیکن صدمات کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک قوم اپنا قبلہ درست کر کے اللہ کی مدد حاصل نہیں کرتی۔ پچھلے ۵۷ سالوں میں ہم سب نے اللہ اور اس کے دین کے ساتھ بے وفائی کی ہے اور اس ملک میں اللہ کی کبریائی کو نافذ کرنے کے بجائے امریکہ کو سب سے بڑا سمجھنے اور ماننے کے اجتماعی جرم میں حکمرانوں کے ساتھ کم و بیش پوری قوم بھی شریک ہے۔ ہمارے اس جرم کی سزا کے طور پر ملک و قوم پر بہت سخت وقت آنے والا ہے اور ہماری باری آئی کھڑی ہے۔ لہٰذا اس وقت قوم کو لوریاں دے کر سلانے اور سرکاری سطح پر جشن بہاراں منانے کی بجائے حقائق کا سامنا کرنے اور سختیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنا چاہئے اور پوری قوم کو مل بیٹھ

کران حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے۔ اس کے لیے حکمرانوں کو بھی اپنی انا کی قربانی دیتے ہوئے نواز شریف اور بے نظیر سمیت تمام سیاسی رہنماؤں پر مشتمل آل پارٹیز کانفرنس بلا کر ان اہم قومی مسائل کا حقیقت پسندانہ حل تلاش کرنا چاہئے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج اگر ہم بدمست امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ٹیکنالوجی کی ترقی کی منصوبہ بندی کا سہارا لینا چاہیں تو اس کے لئے کم وبیش سو سال کا عرصہ درکار ہوگا جبکہ صورت حال یہ ہے کہ ملی وقومی اعتبار سے ہماری موت ہمارے سر پر کھڑی ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ موجودہ عالمی یلغار کا مقابلہ صرف اللہ کی مدد کے سہارے ہی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے اپنے رب کو راضی کرنا ہوگا اور ابتدائی قدم کے طور پر ہمارے حکمرانوں اور ارکان پارلیمنٹ کو دستورِ پاکستان میں موجود اسلامی دفعات کو مؤثر بنانے کی خاطر دستور میں موجود چور دروازوں کو بند کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے تاکہ ملک میں نفاذ شریعت کا عمل ٹھوس اور مثبت انداز میں آگے بڑھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی سودی نظام کے خاتمے کی طرف بھی قومی سطح پر فوری اور مثبت پیش رفت کا آغاز کر دیا جانا چاہئے اور یوں ربّ کی دھرتی پر ربّ کے نظام کے نفاذ کے ذریعے ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں واقعتاً اللہ کی بڑائی کے قیام کا راستہ ہموار ہوگا۔ پوری قوم اگر ملک میں اسلام کے نفاذ کے لئے کمربستہ ہو جائے تو اللہ کی مدد اور نصرت ہمارے شامل حال ہو سکتی ہے۔ امریکی جارحیت کا مقابلہ کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو آزادی کی نعمت جو ہمارے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے' خاکم بدہن' اس سے محرومی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

(۳)

''عیدالاضحیٰ کا اصل پیغام اللہ کے حکم پر ہر قربانی کے لئے تیار رہنا ہے''

۳۰ر جنوری ۲۰۰۴ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

عیدالاضحیٰ کا اصل پیغام اللہ کے سامنے سر جھکا دینا اور اس کے حکم پر اپنی ہر شے قربان کرنے کے لئے تیار رہنا ہے۔ لیکن بحیثیت قوم ہم نے اللہ کے دامن رحمت کو چھوڑ کر غیروں کے آگے سر جھکانے کا جو اجتماعی فیصلہ کیا تھا اسی کا نتیجہ ہے کہ امریکہ جسے راضی کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا' اب اسی سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ بعض غیر ملکی جرائد کے مطابق امریکہ فیصلہ کر چکا ہے کہ عراق کی طرح پاکستان پر حملہ کر کے اس کی ایٹمی صلاحیت کو ختم کر دیا جائے۔ صدر مشرف پر قاتلانہ حملے اور بش کا یہ اعلان کہ دنیا میں جہاں کہیں امریکہ کو

اپنے مفادات کے خلاف خطرہ ہوگا' وہ حملہ کر دے گا دراصل پاکستان کے خلاف کارروائی کے لئے میدان تیار کرنے کی امریکی مہم کا حصہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حکومت نہ چاہتے ہوئے بھی کشمیر پالیسی سے یوٹرن لینے اور ایٹمی سائنس دانوں سے تفتیش کرنے پر بدمست امریکہ کے دباؤ پر ہی مجبور ہوئی ہے۔ لیکن ان حالات میں جشن بہاراں منانے پر تو ہمیں کسی نے مجبور نہیں کیا۔ یہ وقت تو سنجیدگی سے حقائق کا تجزیہ کر کے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا ہے۔ اگر ہم نے اب بھی اس ملک کو اسلامی مملکت بنانے کا فیصلہ نہ کیا تو پھر ہمیں اس انجام بد سے کوئی نہ بچا سکے گا' جس کا فیصلہ امریکہ کر چکا ہے۔ لیکن اگر ہم اللہ اور اس کے دین سے وفاداری کے تقاضے پورے کرنے کا عہد کر لیں تو اللہ کی تائید و نصرت ہمارے شامل حال ہو جائے گی اور جس کا مددگار اللہ ہو اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔

(۴)

''ہماری لاچاری اور بے بسی دین و قرآن سے بے وفائی کا نتیجہ ہے''

۲۳ رجنوری ۲۰۰۴ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

امت مسلمہ کی عزت و سربلندی قرآن اور اس کی تعلیمات کو تھامنے میں ہے۔ دین اور قرآن سے بے وفائی کے سبب ہی ہم آج اللہ کے عذاب کی زد میں ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ پوری امت پر لاچاری اور بے بسی مسلط ہے۔ اسی بے بسی اور لاچاری کا ایک مظہر کشمیر پالیسی سے یوٹرن اور کشمیری مجاہدین کو دہشت گرد قرار دینا ہے۔ سابقہ امت مسلمہ بنی اسرائیل پر بھی اللہ کی کتاب اور دین سے اعراض کے باعث ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی تھی۔ اسی جرم کی پاداش میں یہی ذلت و مسکنت آج ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر کم ہمتی کیا ہوگی کہ ہم اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبردار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے محسن سائنس دانوں کو ملک دشمن قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اس ذلت کے عذاب سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن کی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر دشمنانِ اسلام افغانستان اور عراق کے بعد ہمیں اسی طرح ایک ایک کر کے نشانہ بناتے رہیں گے۔

☆☆☆

(اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے ضمن میں ہدایات)

درس ۱۰

اُمراء کا اپنے رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل

اور اُسوۂ رسول ﷺ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ..... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ (الشُّعراء: ۲۱۴ تا ۲۱۷)

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الحجر: ۸۸)

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝﴾ (الکھف: ۲۸)

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ وَاِذَا

جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الانعام:۵۲ تا ۵۴)

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

اس درس کے تین حصے ہیں اور ہر حصے میں قرآن حکیم کے دو دو مقامات شامل ہیں اور اس کے لئے قرآن مجید کے چھ مختلف مقامات سے آیات منتخب کی گئی ہیں۔ چنانچہ اس درس کے مضامین کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

نرمی، شفقت اور احترام کا برتاؤ

سورۃ الشعراء اور سورۃ الحجر کی آیات میں حضور ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ اپنے بازو ان لوگوں کے لئے جھکا کر رکھئے جو اہل ایمان میں سے آپؐ کا اتباع کررہے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں ارشاد ہوا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (آیت ۲۱۵) ''اور (اے نبیؐ!) اپنے کندھوں کو جھکا کر رکھئے ان لوگوں کے لئے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان میں سے''۔ اور سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (آیت ۸۸) ''اور (اے نبیؐ!) اپنے کندھے جھکا کر رکھئے اہل ایمان کے لئے''۔ ان آیات میں مزید کوئی وضاحت نہیں کی گئی، صرف یہی کہا گیا ہے کہ ''اہل ایمان کے لئے اپنے شانوں کو جھکا کر رکھئے!''

سورۃ الشعراء میں جو ''مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' آیا ہے تو یہ مِنْ تبعیضیہ بھی ہوسکتا ہے اور بیانیہ بھی۔ مِنْ تبعیضیہ ہونے کی صورت میں اس سے مراد یہ ہوگا کہ اگرچہ کہنے کو تو سبھی مسلمان ہیں، لیکن آپؐ کو جو اس طرزِ عمل کا حکم دیا جارہا ہے وہ صرف ان کے لئے ہے جو آپؐ کے بالفعل متبعین ہیں۔ یہاں گویا تخصیص ہو جائے گی کہ قانونی طور پر تو منافقین بھی مسلمان ہیں لیکن ان کے لئے یہ طرزِ عمل مطلوب نہیں، بلکہ ان کے لئے

برعکس طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو سورۃ التوبۃ اور سورۃ التحریم میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ ''اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کیجئے (کشمکش کیجئے) اور ان پر سختی کیجئے!'' یعنی منافقین کے ساتھ تو وہ معاملہ ہونا چاہئے جو کفار کے ساتھ ہے۔ ان کے ساتھ بھی کشمکش کیجئے' جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ ''اور ہونا چاہئے کہ وہ تمہارے اندر اپنے لئے سختی پائیں''۔ لہٰذا اس حوالے سے ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔ اور یہ ''مِنْ'' بیانیہ بھی ہو سکتا ہے' یعنی وہ اہل ایمان جو آپ کی اتباع کریں۔

اب چاہے اسے مِنْ تبعیضیہ مانا جائے یا مِنْ بیانیہ' نتیجے کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اصل حکم ان کے لئے نرمی' شفقت اور احترام کا ہے۔ انہیں اللہ کا عطیہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ نے انہیں میری نصرت و اعانت کے لئے پسند کیا اور چن لیا ہے۔ کسی بھی داعی اور امیر کا اپنے تمام رفقاء اور ماتحتوں کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ ہونا چاہئے! ہر صاحب امر اور ذمہ داری کے منصب پر فائز ہر انسان کو اپنے ماتحت معاونین اور ساتھیوں کے ساتھ یہی رویہ رکھنا چاہئے' تاکہ انہیں بھی محسوس ہو کہ ان کے دلوں میں ان کی وقعت ہے' یہ ان کی قدر کرتے ہیں اور ان پر شفقت کرتے ہیں۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں وہی الفاظ آئے ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے ساتھ طرزِ عمل کے ضمن میں آئے ہیں کہ: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝﴾ (آیت ۲۴) ''اور جھکا دو اُن دونوں (والدین) کے لئے تواضع و انکسار کے شانے رحمت سے اور دعا کرو کہ اے میرے ربّ! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے میری بچپن میں پرورش کی''۔ اس سے متصلاً قبل فرمایا: ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝﴾ ''اور انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو' اور ان سے بات کرو تعظیم کے ساتھ''۔ اب وہی طرزِ عمل ''خفضِ جَناح'' کے الفاظ میں یہاں پر ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس سے اس

کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا جو بھی کسی چھوٹی یا بڑی جمعیت کا ذمہ دار شخص ہو' جو بھی اجتماعیت پر امیر ہو' خواہ بڑی تعداد میں لوگ اس کی تحویل میں ہوں یا تھوڑی تعداد میں' اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا طرزِ عمل اس طرح کا ہونا چاہئے۔

آگے فرمایا: ﴿ فَاِنْ عَصَوْکَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَکَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝ ﴾ ''پھر اگر یہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں تو اس سے بَری ہوں جو طرزِ عمل تم اختیار کر رہے ہو۔ اور آپ اس ذات پر توکل کیجئے جو عزیز بھی ہے رحیم بھی ہے''۔ یعنی مامورین اگر کوئی نافرمانی کرتے ہیں تو بھی انسان ان سے اپنا اظہارِ براءت تو ضرور کر دے کہ میں تمہارے اس عمل سے بری ہوں' لیکن اس سے کوئی تشویش نہ ہو۔ اس لئے کہ معاملہ توکل کا کل اللہ کے حوالے ہے' البتہ اپنا توکل اللہ پر رکھو' اپنی گنتی پر نہ رکھو' اپنے ساتھیوں سے زیادہ امیدیں وابستہ ہی نہ کرو' امید وابستہ کرو تو صرف اللہ کی ذات سے۔ جیسے اقبال نے کہا۔

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

جس شخص کی امید انسانوں سے وابستہ ہو جاتی ہے جب ان کی طرف سے اس کی امید کے برعکس رویہ ظاہر ہوتا ہے تو اس پر ردِّعمل کے طور پر مایوسی طاری ہوتی ہے اور اس کے قویٰ جواب دیتے ہیں' اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ اور جس کی ساری امید اللہ ہی کی ذات کے ساتھ ہو اُس صورتِ حال میں اس کا طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کے غلط طرزِ عمل سے وقتی طور پر افسوس ہونا تو بالکل فطری بات ہے لیکن اس پر کوئی مستقل منفی اثرات مترتب نہیں ہوں گے' اس لئے کہ اس کا توکل کُل کا کُل اللہ پر ہے' اپنے ساتھیوں پر نہیں۔

یہ مضمون چونکہ آگے آ رہا ہے اس لئے اس وقت میں نے آیت کے صرف اس حصے کو بیان کیا ہے کہ: ﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ اس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امراء سے اپنے مامورین کے حق میں جو روش درکار

ہے اس کا ایک وصف لازم ''خفضِ جَنَاح'' ہے یعنی ان کے سامنے اپنے کندھے رحمت اور شفقت سے جھکا کر رکھنا' ان کے سامنے تواضع اختیار کرنا' تحکمانہ لہجہ اور انداز اختیار نہ کرنا۔

کم حیثیت ساتھیوں کی دلجوئی

امراء کے لئے دوسرا مطلوبہ وصف خاص طور پر اُن ساتھیوں کی دلجوئی ہے جن کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقات سے ہو۔ یہ کسی اجتماعیت کے اندر ایک بڑا عملی مسئلہ ہوتا ہے جس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ایک طرف تصوریت (idealism) ہے اور دوسری طرف حقیقت پسندی (realism)' ان دونوں چیزوں کو بیک وقت تھام کر رکھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے اور اس کے لئے جو بھی قانون اللہ نے بنا رکھا ہے اس کے اعتبار سے کسی بھی انقلابی جدوجہد میں صاحب حیثیت لوگ آئیں گے تو گاڑی چلے گی' صاحب ثروت لوگ آئیں گے تو وسائل جمع ہوں گے' صاحب وجاہت لوگ آئیں گے تو کچھ لوگ ان کے اثرات کی وجہ سے کھنچ کر آ جائیں گے۔ یہ حقیقت پسندی (realism) ہے' اور اسے نظر انداز کرنا غلطی ہوگی' یہ اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنے کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے خاص طور پر دعا کی کہ اے اللہ! عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے ایک کو تو ضرور میری جھولی میں ڈال دے۔ آپ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ ان حضرات کی معاشرے میں ایک حیثیت ہے' ایک مقام ہے۔ پھر یہ کہ ان کا ایک کردار ہے' ایک دفعہ جو بات تسلیم کر لیں اس پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ ایسے باہمت اور باعزیمت لوگ آگے آئیں تو تحریک یا اجتماعیت کی گاڑی چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص بلند ترین تصوریت کے آسمان پر پہنچ جائے اور وہاں سے نیچے ہی نہ اترے اسے تو یہ بات قابل اعتراض نظر آئے گی کہ حضور ﷺ طائف گئے اور وہاں صرف تین سرداروں سے ملے۔ کیا صرف ان کو دوزخ کی آگ سے بچانا مطلوب تھا؟ کیا وہاں کی عوام کا حق

نہیں تھا؟ نبی کی دعوت تو عام ہونی چاہئے' اسے تو ایک ایک انسان کو جہنم کی آگ سے بچانا مطلوب ہے۔ حضرت علی ؓ سے حضور ﷺ نے خود فرمایا: ((لَاَنْ یَھْدِیَ بِکَ اللّٰہُ رَجُلًا وَاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ)) ''اگر ایک انسان کو بھی اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر دولت ہے''۔ کیا طائف میں اور انسان نہیں تھے؟ یہ وہ واقعیت پسندی اور حقیقت پسندی (realism) ہے جسے میں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ میں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ یہ چیزیں عملی طور پر ہوتی ہیں۔

انقلابی دعوت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اوّلاً اعلیٰ طبقات کو اپنا ہدف بناتی ہے' لیکن اس میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ نچلے طبقات سے لوگ آتے ہیں' یعنی غرباء' فقراء' غلام' مسکین' اس لئے کہ ان کے پاؤں کی بیڑیاں اتنی بھاری نہیں ہوتیں جتنی سرمایہ داروں اور سرداروں کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ اگر اس دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کی دولت' حیثیت اور وجاہت متاثر ہوتی ہے' سرمایہ جاتا ہے' سرداری جاتی ہے' چودھراہٹ جاتی ہے۔ آپ نے حضرت مسیح علیہ السلام کا جملہ سنا ہوگا کہ ''اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر سکتا ہے لیکن کوئی دولت مند انسان آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا''۔ یہ اگرچہ قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے' لیکن یہ ایک عظیم حقیقت ضرور ہے۔ تو ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھئے۔ اعلیٰ طبقات سے جو لوگ آتے ہیں ان میں سے ایک ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ ابوبکر' عثمان' طلحہ' زبیر' سعد بن ابی وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف' سعید بن زید رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جو مقام ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں آپ عشرۂ مبشرہ کہتے ہیں۔ بعد میں ان میں حضرت عمر ؓ بھی ایمان لا کر شامل ہوئے۔ لیکن یہ تو چھٹے سال کی بات ہے' جبکہ مقدم الذکر وہ لوگ ہیں جو شروع میں ایمان لائے اور ان میں سے ہر ایک کا جو مقام ہے وہ ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن جو فقراء و غرباء آنحضور ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لائے ان میں ہر ایک کی خواہش تھی کہ حضور ﷺ کی عنایت مجھ پر ہو اور ہم حضور ﷺ

کی توجہ کا مرکز بنیں' جبکہ حضور ﷺ کے سامنے اس تحریک کی اپنی ایک مصلحت تھی۔ فرض کیجئے کہ فقراء اور مساکین آپ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس وقت کوئی قریشی سردار آ گیا ہے تو اُس وقت آپ اس کی طرف التفات فرمائیں گے۔ یہ اس حقیقت پسندی کا تقاضا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ان فقراء اور مساکین کے دلوں پر چرکہ لگے اور انہیں گمان ہو کہ کہیں ان کی نگاہ میں بھی دولت ہی کا تو اصل مقام نہیں ہے؟ کیا (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) ان کی نگاہ میں بھی دنیاوی مال و دولت اور وجاہت کی وہی قدر و قیمت ہے جو دوسروں کی نگاہوں میں ہے؟ تو اس سے شک و شبہ پیدا ہوگا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ تھا' جس سے سورۂ عبس کا آغاز ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۞ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۞ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی ۞ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی ۞ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۞ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ۞ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ۞ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ۞ وَهُوَ یَخْشٰی ۞ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۞ کَلَّآ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ ۞ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَهٗ ۞ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ ۞ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۞ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۞ کِرَامٍ بَرَرَةٍ ۞﴾ (آیت ۱-۱۶)

''ترش رو ہوا اور بے رخی برتی۔ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ (اے نبیؐ!) تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے' یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نفع بخش ہو! جو شخص بے پروائی برتتا ہے' اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے' اور ڈر رہا ہوتا ہے' اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند رتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

اس انداز میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص شانِ جلالی ظاہر ہو رہی ہے۔ کچھ قریشی سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضور ﷺ ان سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اس دوران حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم آ گئے جو ایک نابینا صحابی تھے۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکے کہ صورت حال کیا ہے۔ وہ

اب بار بار حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں' جبکہ حضور ﷺ قریشی سرداروں سے محوِ گفتگو ہیں۔ ان سے حضور ﷺ کی (معاذ اللہ) کوئی ذاتی غرض نہ تھی' بلکہ ان غرباء اور فقراء کی مصلحت بھی اس میں تھی کہ یہ صاحب حیثیت لوگ ایمان لے آئیں تو انہیں کچھ تحفظ حاصل ہو۔ دین کی مصلحت بھی اس میں تھی کہ اقامت دین کی گاڑی آگے چلے گی۔ لیکن اُس وقت حضور ﷺ کو ذرا سی ناگواری ہوگئی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی کہ آپؐ کو یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس کا ایک اور رخ بھی ہے کہ کفار اسے غلط رنگ دیتے تھے کہ اے محمدؐ! ہم تو آپؐ کے پاس آنا چاہتے ہیں' لیکن آپ نے ہمارے ان غلاموں کو جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں' اپنے گرد جمع کر رکھا ہے تو ہم کیسے آئیں! بہرحال ہمارا ایک مقام ہے۔ ہم اپنے مرتبے سے گر کر ان لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے' لہٰذا اگر ہم سے گفتگو کرنی ہے تو ان کو ہٹائیے۔ یہ ان کی چال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے اندر بددلی پیدا ہو اور جو جمعیت اکٹھی ہوئی ہے وہ بھی ساتھ نہ رہے اور ہم نے تو ساتھ دینا ہی نہیں ہے۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں تفصیل سے آیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے خاص طور پر ان کی قوم کے سرداروں نے کہا تھا کہ ﴿ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ﴾ ''اور ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں ارازِل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے''۔ یہ جو تمہارے گرد کچھ لوگ جمع ہیں یہ تو ہمارے گھٹیا درجے کے لوگ ہیں۔ اور یہ چشم سر سے دکھائی دے رہا ہے کہ کون لوگ تمہارے گرد جمع ہو گئے ہیں' ان کے اوپر گھمنڈ نہ کرنا' ان کی ہمارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔

تو یہ ایک نفسیاتی پیچیدگی ہے جو ہر تحریک کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور عملاً یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسائل ایک طرح سے اس دنیا میں پل صراط کے مانند ہیں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ تھوڑا سا اِدھر ہو جائیں تو بھی تباہی ہے اور تھوڑا سا اُدھر ہو جائیں تو بھی تباہی ہے۔ ایک طرف Idealism ہے اور دوسری طرف Realism ہے۔ ایک طرف واقعہ یہ ہے کہ اصل اہمیت تو

تقویٰ' خشیت' انابت اور ایمان کی ہے اور دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی چیز کی کامیابی کا دارومدار اگرچہ بالکلیہ تو اللہ پر ہے لیکن اس کے جو بالفعل عوامل ہیں ان میں حیثیت اور وجاہت جیسی چیزیں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ ان دونوں کے مابین ایک معتدل روش اختیار کرنے کے لئے بڑی بیدار مغزی اور فہم و فراست کی ضرورت ہے۔ اس میں تھوڑا سا اِدھر اُدھر ہو جانا قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی بھی اس معاملے میں گرفت ہوئی ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! ہم سے تو خطا کا امکان سو گنا زیادہ رہے گا۔ تاہم اگر اصولی بات سامنے رکھتے ہوئے انسان اس معاملے میں متوازن رویہ قائم کرنے کی کوشش کرتا رہے تو اس کے لئے مفید ہو گا کہ قرآن حکیم کے ان مقامات کو اپنے سامنے رکھے جن میں اس کے لئے ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ سورۃ الکہف میں فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ (آیت ۲۸) ''اور روکے رکھئے اپنے آپ کو (تھامے رکھئے اپنے آپ کو) ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے ربّ کو صبح و شام پکارتے ہیں' وہ اسی کے روئے انور کے طالب ہیں (اس کی رضا چاہتے ہیں)۔'' انسان کسی سے خوش ہوتا ہے تو اپنے پورے رخ کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سے ناراض ہیں تو رخ دوسری طرف کر لیں گے اور بات کریں گے بھی تو آنکھوں میں آنکھیں نہیں ملائیں گے' بلکہ ذرا مغائرت کے ساتھ جواب دیں گے' اس سے زیادہ التفات نہیں ہو گا۔ چنانچہ اللہ کا رُخ چاہنا یا اللہ کے روئے انور کا طالب ہونا سے مراد ہے اس کی عنایت' شفقت اور محبت کی طلب کرنا کہ اللہ ان سے راضی ہو جائے' ان پر اللہ کی نظر کرم ہو۔ وہ اس کی عنایتوں کے طالب رہتے ہیں اور صبح و شام اس کو پکارتے رہتے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ ''اور ان سے اپنی نگاہ نہ پھیریئے۔'' آپ دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ آپ کی توجہ کا اصل مرکز یہ ہونے چاہئیں' ان کی تربیت اور تزکیہ کیجئے' ان کو بہتر سے بہتر کیجئے! ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچانے کے لئے مسلسل کوشاں رہئے اور ان سے اپنی توجہ کو ہٹائیے نہیں۔

آگے فرمایا: ﴿تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ ''کیا تم دُنیوی زندگی کی زینت چاہتے ہو؟'' یہ قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ہے۔ لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ ''تم چاہتے ہو دنیا کی زندگی کی چمک دمک'' لیکن ہم اس کی تاویل اس طرح کریں گے کہ آپ کے ظاہری طرزِ عمل سے لوگوں کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ آپ بھی (معاذ اللہ) دُنیوی زینت کے طلب گار ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کے یہاں تو ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' کی رو سے طرزِ عمل کا معاملہ نیت پر موقوف ہے اور اللہ آپ کی نیت کو جانتا ہے۔ لیکن دنیا تو ظاہر سے فیصلہ کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپؐ کے ساتھی یہ سمجھیں کہ ہماری طرف نگاہِ کرم نہیں ہے' بلکہ نظر التفات ان صاحب حیثیت لوگوں کی طرف ہے اور شاید آپؐ کے دل میں بھی انہی چیزوں کی قدر و قیمت ہے۔ چلئے یہ تو اپنے ہیں' آپ ان کی غلط فہمی رفع کر دیں گے' لیکن آپ کے مدمقابل بھی تو اسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ ان کی اقدار اور ترجیحات بھی وہی ہیں جو ہماری ہیں' ان کی نگاہ میں بھی انہی چیزوں کی قدر و قیمت ہے جن کی ہماری نگاہوں میں قدر و قیمت ہے۔ تو یہ درحقیقت اس اندیشے کا سدباب ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ پر (معاذ اللہ) الزام عائد کر رہے ہیں کہ آپ بھی فی الواقع حیاتِ دُنیوی کی زینت کے طالب ہیں۔

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ ''اور آپؐ اس کا کہنا نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے''۔ نوٹ کیجئے یہاں الفاظ ہیں کہ انہیں ہم نے غافل کیا ہے' اصل میں وہ ہمارے یہاں سے مردود اور راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں۔ جیسے قرآن میں اہل ایمان کے لئے الفاظ ہیں کہ ''اللہ نے انہیں پسند کر لیا ہے'' اسی طرح جن کو یہ توفیق نہیں ملی گویا اللہ نے انہیں رد کر دیا ہے۔ اللہ نے انہیں آپؐ کی رفاقت و اعانت کے قابل ہی نہیں سمجھا تو ان کے دلوں کو اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ اب اگر وہ صاحب حیثیت ہیں یا اصحاب سیادت و قیادت ہیں تو بھی آپ ان کو چنداں اہمیت نہ دیجئے اور ان کی بات نہ سنئے! میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان

میں امر کے معانی حکم اور مشورہ دونوں کے آتے ہیں۔ اسی طرح اطاعت کا معنی بالفعل کسی کی بات پر عمل کر لینا بھی ہے اور دلی آمادگی سے کسی کی بات بالفعل سن لینا بھی ہے۔ تو یہاں وَلَا تُطِعْ کا ترجمہ ہوگا کہ ''آپ ان کی بات پر کان ہی نہ دھریئے''۔ وہ لوگ آتے تھے اور حضور ﷺ کو طرح طرح کی مصلحتیں سمجھاتے تھے' مداہنت کی کوشش کرتے تھے۔ بار بار سفارتیں آ رہی ہیں' قریش کے بڑے بڑے سردار وفد کی صورت میں آتے تھے اور کہتے تھے کہ اے محمد (ﷺ)! جہاں آپ اشارہ کر دیں وہاں آپ کی شادی کر دی جائے گی' آپ جتنی کہیں گے دولت کا ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے' اور (معاذ اللہ) اگر آپ بادشاہ بننے کی ہوس میں ہیں تو اگرچہ آج تک کوئی ہمارا بادشاہ نہیں ہے اور ہم کسی کو بادشاہ تسلیم کرنے کے خوگر اور عادی نہیں ہیں' حریت ہمارے مزاج کا ایک جزو لاینفک ہے' لیکن ہم آپ کو بادشاہ مان لیتے ہیں۔ ہماری طرف سے یہ تمام پیشکشیں موجود ہیں۔ تو فرمایا گیا کہ اس طرح کی بات سننا بھی خطرے کی علامت ہے۔ آپ انہیں ایسا تاثر بھی نہ دیں کہ چلو بات سن تو رہے ہیں۔ اس سے انسان کو غلط امید وابستہ ہو جاتی ہے۔ مزید فرمایا: ﴿ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ ﴾ ''اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے''۔ یعنی آپ ان کی بات پر توجہ بھی نہ فرمایئے جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ وہ راندۂ درگاہ ہیں' ہم نے انہیں مسلوب التوفیق کر دیا ہے۔ اور وہ تو اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے تمام معاملات حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ہر معاملے میں نظر آ رہا ہے کہ وہ کسی حد کے پابند نہیں ہیں' ان کی زندگی تو اس گھوڑے کی مانند ہے جس کی باگ ٹوٹ چکی ہو۔

یہی مضمون سورۃ الانعام میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ ﴾ (آیت ۵۲) ''اور مت دھتکاریے (اپنے سے دُور مت کیجئے) ان لوگوں کو جو اپنے ربّ کو صبح و شام پکارتے ہیں' وہ اس کے رخِ انور (اس کی رضا) کے متلاشی ہیں''۔ وہ اس کے نام کی مالا جپتے ہیں' اس کی تسبیح و تحمید و

تہلیل کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں پنج وقتہ نماز کا نظام قائم نہیں ہوا تھا اور صرف صبح وشام کی نماز تھی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پنج وقتہ نماز کے نظام سے قبل کبھی دو اور کبھی تین وقت کی نماز تھی' بلکہ ابتدا میں تو صرف قیام اللیل ہی تھا۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل کے نزول کے بعد پنج وقتہ نظامِ صلوٰۃ قائم ہوا تو بات مختلف ہوگئی۔ یہاں صبح وشام اللہ کو پکارنے سے مراد صبح وشام کی نماز ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ''آپ پر ان کے حساب کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں ہے اور نہ اُن پر آپ کے حساب کی کچھ ذمہ داری ہے''۔ ایک جگہ اہل ایمان سے یوں خطاب ہوا ہے: ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ﴾ ''(لوگو!) ان (حضور ﷺ) پر وہ ذمہ داری ہے جس کا بوجھ ان پر ڈالا گیا ہے (وہی اس کے مسئول ہوں گے) اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے (اس کے مسئول تم ہی ہو)'' تو یہاں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور بصیغہ غائب اہل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کہ ''آپ پر ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے' وہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے وہ اپنا حساب اللہ کے ہاں خود دیں گے' اور نہ آپ کے حساب میں سے کسی شے کی مسئولیت ان پر ہے۔ آپؐ کو اپنا کام کرنا ہے اور آپؐ کا کام ہے پہنچا دینا۔ ﴿إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾ ''آپ پر نہیں ہے مگر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری''۔ اب کون قبول کرتا ہے کون نہیں کرتا اس کی کوئی جواب دہی آپ سے نہیں ہے۔ ابوجہل نے کیوں نہیں مانا' بلالؓ نے کیوں مان لیا؟ اس سے آپ کا سروکار نہیں ہے۔ یہ یا تو ان کا ارادہ ہے یا اللہ کی توفیق' دو ہی عوامل ہیں۔ آپ بلاتفریق اور بلاکم وکاست پہنچا دیجئے۔ اب کسے اللہ نے توفیق دی اور کسے ردّ کر دیا' یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون ردّ کئے جانے کے قابل تھا۔ نہ آپ کے ذمہ ان کے حساب میں سے کوئی شے ہے اور نہ ان پر آپ کے حساب میں سے کوئی ذمہ داری ہے۔ ﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ ''تو اگر آپ انہیں دھتکار دیں گے تو (معاذ اللہ) آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے''۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ﴾ (آیت ۵۳) ''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے' تاکہ یہ (انہیں دیکھ کر) کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے بڑا احسان فرمایا ہے؟'' یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو ہم قبول کرتے۔ یہ غریب غرباء' غلام' بے حیثیت لوگ' کیا یہ ہیں جن پر اللہ کا کرم ہوا؟ اگر یہ ایسے ہی اللہ کے لاڈلے اور پیارے تھے تو ان پر پہلے اللہ کا فضل و کرم کیوں نہیں ہوا اور کیوں انہیں اللہ نے مفلسی میں ڈالا ہوا تھا؟ کیوں ان کو فاقوں میں مبتلا کیا ہوا تھا؟ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر دنیا میں کسی کو کوئی حیثیت حاصل ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اس پر مہربان ہے۔ تو اگر اللہ دنیا میں ہم پر مہربان ہے تو یہ شے اگر واقعتاً قیمتی ہوتی تو ہمیں ملتی' انہیں نہ ملتی۔ یہ وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا کہ اللہ نے ان کو ان کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے اور وہ ان کے لئے اس حق کے پہچاننے میں ایک اوٹ بن گئے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ خوب واقف نہیں ہے اپنے ان بندوں سے جو شکر کرنے والے ہیں؟'' اللہ ان کو خوب جانتا ہے جو اس حق (قرآن) کی اصل قدر و قیمت سے واقف ہیں اور اس کا شکر ادا کرنے والے ہیں۔

اب سورۃ الانعام کی اگلی آیت میں ایک اضافی بات آ رہی ہے۔ فرمایا: ﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ﴾ ''اور جب آپ کے پاس (اے نبیؐ!) آئیں وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہئے: تم پر سلامتی ہو' تمہارے ربّ نے (تمہارے لئے) اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے''۔ اب یہاں وہی نقشہ آ رہا ہے جو پہلے حصے میں تھا' یعنی شفقت اور تبشیر کا انداز۔ آنحضور ﷺ کی دعوت کے دونوں پہلو ہیں' جہاں انذار ہے وہاں تبشیر بھی ہے۔ آپؐ اپنے ساتھیوں کے لئے مبشر تھے' حوصلہ افزائی فرمانے والے تھے۔ ظاہر ہے بشارت کے اور کون مستحق ہوں گے؟ اب اس بشارت

اور رحمت کا مظہر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''یہ کہ اگر تم میں سے کوئی جہالت کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھے' پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ (اللہ تعالیٰ) معاف کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

یہاں ''اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ'' میں ''مِنْكُمْ'' اہم ہے۔ یعنی جن لوگوں نے رخ ہی غلط اختیار کیا ہوا ہے تو اب اگر ان کی کوئی نیکی بھی ہے تو وہ کسی کھاتے میں نہیں' جبکہ تم سیدھے راستے پر آ گئے ہو' تم نے اپنا رخ درست کر لیا ہے' تم نے وہ منزل طے کر لی ہے کہ ﴿اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا﴾ (میں نے تو اپنا رخ پھیر لیا ہے یکسو ہو کر اس ہستی کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے) تو اگر تم میں سے کسی سے کسی وقت کوئی خطا سرزد ہو جائے' کوئی غلط حرکت صادر ہو جائے جہالت کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ یہاں ''بِجَهَالَةٍ'' کے لفظ کو بھی سمجھ لیجئے! اردو میں تو جہالت اَن پڑھ اور ناواقف ہونے کو کہتے ہیں' جبکہ عربی میں اگرچہ اس کا یہ مفہوم بھی ہے' لیکن یہ تابع ہے' اصل مفہوم یہ ہے کہ جذباتی ہونا' مشتعل مزاج ہونا۔ عمرو بن ہشام کو ابوجہل اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ہی مشتعل مزاج اور اکھڑ مزاج آدمی تھا۔

یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر جذبات کی رو میں بہہ کر یا عدمِ واقفیت کی بنا پر انسان سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے' پھر اس کے بعد وہ اس سے توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے' اپنے رویئے کو درست کر لے' یہ نہیں کہ پرنالہ وہیں بہتا رہے' تو یقیناً اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ (توبہ کا پورا تصور ہمارے منتخب نصاب نمبر ا کے درس میں جو کہ سورۃ الفرقان پر مشتمل ہے' آ جاتا ہے) یہ گویا کہ تبشیر و بشارت ہے کہ اللہ کی شانِ غفاری کو بار بار اُن کے سامنے لاتے رہنا کہ اگر خطا ہو گئی ہے تو کوئی بات نہیں ہے' تم بھی استغفار کرو' میں بھی تمہارے لئے استغفار کروں گا' اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے گا۔ اُسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں امراء کی طرف سے اپنے ساتھیوں کی اسی طرح

حوصلہ افزائی ہوتی رہنی چاہئے۔

رأفت ورحمت اور خوئے دلنوازی

یہاں سے اب تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ وہی کیفیت جو پہلے حصے میں آئی تھی' یہاں اور زیادہ نمایاں ہو کر' زیادہ گاڑھی شکل میں نکھر کر اور ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک تو سورۃ التوبۃ کے آخری حصے کی آیت ہے جو بڑی پیاری آیت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے اہل ایمان کے ساتھ معاملے کی شاید اتنی پیاری تعبیر آپ کو کہیں اور نہ ملے۔ اسی کا ایک عکس داعی حق کے اندر اپنے ساتھیوں کے لئے ہونا چاہئے۔ کسی بھی چھوٹے یا بڑے امیر سے اپنے مامورین کے لئے یہی کیفیات مطلوب ہیں' اس لئے کہ ہمارے لئے تو مشعل راہ اُسوۂ محمدیؐ ہی ہے' ہمیں چلنا تو آپ ﷺ ہی کے نقش قدم پر ہے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبۃ: ۲۸) ''(لوگو!) آ گئے ہیں تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے''۔ مِنْ اَنْفُسِكُمْ کے مختلف درجات ہوں گے۔ ہرگز یہ نہ سمجھئے کہ ہم ان میں نہیں ہیں۔ اس کا مصداق پہلے درجے میں بنو ہاشم اور دوسرے درجے میں قریش ہیں' اس لئے کہ بنو ہاشم قریش کا ایک گھرانہ ہے۔ تیسرے درجے میں اہل عرب (اُمّیین' بنو اسماعیل) آئیں گے اور چوتھے درجے میں پوری بنی نوع انسانی ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ بھی بنی آدم میں سے ہیں' حوا کے بیٹے ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں درجہ بدرجہ تمام نوعِ انسانی شریک ہو جائے گی۔

آگے ارشاد ہے: ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ ''بہت شاق گزرتی ہے ان پر وہ چیز جو تمہارے لئے تکلیف دہ ہے''۔ جو چیز تم پر بھاری پڑ رہی ہو وہ اُن پر بہت گراں گزرتی ہے۔ وہ تو تمہارے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر چاہتے ہیں۔ اگر وہ تمہیں کھینچ رہے ہیں تو خیر کی طرف کھینچ رہے ہیں' ترغیب دے رہے ہیں تو بھلائی کے لئے دے رہے ہیں۔ بظاہر تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ''جنت ایسی چیزوں سے گھیر دی گئی ہے جو نفس انسانی کو پسند

نہیں ہیں'' لیکن تم یہ کانٹوں بھری باڑ عبور کر کے ہی جنت میں داخل ہو سکو گے۔ وہ اگر تمہیں ان کانٹوں بھری باڑ کی طرف لے جا رہے ہیں تو درحقیقت وہ تمہیں اس جنت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ﴾ ''وہ تم پر بہت ہی حریص ہیں''۔ یعنی تمہارے لئے ہر خیر کے طالب ہیں' ہر بھلائی کے جویا ہیں۔

یہاں نوٹ کیجئے کہ ابھی اہل ایمان کی تخصیص نہیں ہے' اہل ایمان کی تخصیص آگے چل کر آئے گی۔ یہ تو حضور ﷺ کی وہ قلبی کیفیت ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لئے تھی۔ آپ ﷺ کا سینہ مبارک نہایت کشادہ ہے کہ ہر فردِ نوعِ بشر کے لئے آپ چاہیں گے کہ وہ سختی سے بچے اور اس کے لئے خیر و فلاح ہو' اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب ہوں۔ حضور ﷺ کے مزاج میں کوئی بخل نہیں ہے۔ اس لئے کہ سابقہ انبیاء و رُسل کے برعکس آپ پوری نوعِ انسانی کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ انبیاء و رُسل کے ہاں ہمیں عالمگیر پیغام نہیں ملتا' بلکہ موجودہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں کہ ''یہ پیغام دوسروں کے لئے نہیں ہے''۔ اور ایسے سخت الفاظ بھی آئے ہیں کہ ''کوئی شخص اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالتا' یہ تمہارے بچوں (یعنی بنی اسرائیل) کے لئے ہے''۔ یہ بھی آیا ہے کہ ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں''۔ اگرچہ ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان الفاظ کی نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف درست ہے یا نہیں' لیکن منطقی طور پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام کی بعثت بنی اسرائیل کی طرف تھی۔ قرآن مجید میں ﴿رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اور سوائے محمد رسول اللہ ﷺ کے باقی تمام رسول کسی نہ کسی معین قوم' قبیلے یا شہر کی طرف بھیجے گئے تھے۔ صرف حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ بابرکات اس سے مستثنیٰ ہے کہ جن کی بعثت عام ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ ''(اے نبی!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ اس پہلو سے

یہاں جامعیت ہوگی' اس لئے کہ دعوت حق کے لئے یہی کیفیت تو مطلوب ہے کہ یہ خیر خواہی کے جذبے سے ہو۔ چونکہ آپ ﷺ نے پوری نوعِ انسانی کو دعوت دینی ہے تو اگر پوری نوعِ انسانی کے لئے خیر خواہی نہیں ہوگی تو دعوت کا تقاضا ابتدائی درجہ میں بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہاں ابھی تخصیص نہیں ہے' بلکہ عموم ہے۔ اسی لئے میں نے ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ کے مفہوم میں اس کا دائرہ بنی ہاشم سے لے کر بنی آدم تک وسیع کیا ہے۔ اور ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ﴾ میں بھی پوری نوعِ انسانی آئے گی۔

البتہ آیت کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''(آپ ﷺ) مؤمنین کے حق میں انتہائی رؤف اور رحیم ہیں''۔ ''رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ'' کے الفاظ پر مکمل بحث سورۃ الحدید کے چوتھے رکوع کے ضمن میں ہوئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سورۃ الحدید کے پہلے رکوع میں رء وف رحیم کی صفت اللہ کے لئے آئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آیت ۹) ''وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے' تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے''۔ اور سورۃ الحدید کے آخری رکوع میں یہ الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ ''اور ان کے دلوں میں ہم نے رأفت اور رحمت پیدا کر دی جنہوں نے آپ (علیہ السلام) کی پیروی کی''۔ جبکہ یہاں رؤف اور رحیم کے الفاظ حضور ﷺ کے لئے آئے ہیں۔ یہ جان لیجئے کہ یہ ایک ہی کیفیت کے دو رُخ ہیں۔ پہلے کسی سے ہمدردی ہوتی ہے' پھر اس کی مدد کی جاتی ہے۔ پہلے کسی کے دکھ کو آپ اپنے اندر محسوس کریں' تب ہی تو آپ اس کی مدد پر آمادہ ہوں گے۔ ان کیفیات کو فزیالوجی میں sensory اور motor کہا جاتا ہے۔ یعنی پہلے آپ کو احساس ہوا کہ مجھے ہاتھ پر کسی چیز نے کاٹ لیا ہے' پھر آپ کا ہاتھ

ایک دم وہاں سے ہٹا۔ ایک لمحے پر محیط یہ عمل دراصل اس طور سے انجام پاتا ہے کہ جہاں کانٹا گیا وہاں سے sensation دماغ میں گئی' دماغ نے اسے interpret کیا کہ وہاں کوئی تکلیف دہ شے ہے' وہاں سے فوراً ہاتھ جھٹک دینا چاہیے۔ وہاں سے احکام صادر ہوئے اور وہ motor nerves کے ذریعے ان عضلات تک پہنچے کہ حرکت کرو تا کہ ہاتھ یہاں سے ہٹ جائے۔ اسی طرح سے یہ ایک sensory پہلو ہے جس سے آپ کسی کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ جیسے امیر نے کہا:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

''رأفت'' ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا مظہر ہے اور ''رحمت'' ﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ کا مظہر ہے۔ اور آپؐ کی ذات میں یہ دونوں مظہر اہل ایمان کے حق میں بتمام و کمال موجود تھے۔ ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ یعنی آپ اہل ایمان کے دکھ درد کو محسوس کرنے والے اور ان کے حق میں انتہائی شفیق اور مہربان ہیں' دکھ درد کو دور کرنے والے ہیں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی شان ہے اہل ایمان کے حق میں۔ اسی طرح جو بھی آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کو دعوت دیتا ہے اسے اسی کا ایک عکس اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔ جیسے اقبال نے کہا ہے کہ سالارِ کارواں کی اصل متاع یہی ہے کہ نفس گرم بھی ہو اور دلِ روشن بھی ہو' اپنے ساتھیوں کے حق میں بہت نرم خو ہو اور ان کے دلوں کو موہ لینے والا بھی ہو۔ یہ ساری کیفیات مطلوب ہیں۔

اب ہم سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ آیت اس سلسلے کی اہم ترین آیت ہے۔ فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ ۚ﴾ ''(اے نبیؐ) یہ اللہ کی رحمت کا سبب ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہیں''۔ اب تک ہم نے جن آیات کا مطالعہ کیا ہے ان میں آپ ﷺ کو ہدایات تھیں کہ آپ اہل ایمان کے لئے یہ طرزِ عمل اختیار کیجئے' جبکہ یہاں کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ فی الواقع مؤمنین کے لئے انتہائی شفیق اور رحیم ہیں۔ اب یہیں سے یہ

موضوع شروع ہو رہا ہے کہ یہ سب اللہ کی رحمت اور شفقت کا مظہر ہے کہ اے نبیؐ! آپؐ اہل ایمان کے حق میں بہت نرم ہیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا مزاج اور آپؐ کی طبیعت کی ساخت ہی اس طرح بنائی ہے۔ ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪﴾ ''اور اگر آپ سخت دل اور تند خو ہوتے تو یہ آپؐ کے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے''۔ جیسے اقبال نے کہا ہے: ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

اس کے برعکس اگر امیر کارواں میں خوئے دل نوازی ہو تو لوگ اس کے گرد کھنچے چلے آتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں؟
فقط یہ بات' کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق!

تو اگر داعیٔ حق تند خو اور سنگدل ہو تو لوگ منتشر ہو جائیں گے۔

اب اصل بات یہ ہے کہ کیا کرنا چاہئے! نرمی تو آپؐ کے دل میں ہے' لیکن اس نرمی کا ظہور کیسے ہو۔ اس کے لئے آپ ﷺ کو چار کام گنوائے جا رہے ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''آپ انہیں معاف کرتے رہا کریں''۔ اس کی ضرورت ہر صاحب امر کو ہے' چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ سورۃ التغابن میں اہل وعیال کے بارے میں ہدایت قرآنی ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (آیت ۱۴) ''اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور اور رحیم ہے''۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل وعیال کی تربیت کے لئے معاف کرنے کی خو نہایت مؤثر ہے۔ اس لئے کہ ہر وقت کا دنگا فساد' ڈانٹ ڈپٹ' اٹھتے بیٹھتے کی جھڑکی' یہ سب چیزیں گھر کے اندر میدانِ کارزار کا سا ماحول پیدا کرنے کے مترادف ہیں' اور ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اس سے ضد' ہٹ دھرمی اور اپنی غلطی پر اصرار جیسے برے نتائج نکلتے ہیں' انسان ڈھیٹ ہو جاتا ہے' شرم و حیا کے پردے

چاک ہو جاتے ہیں۔ تو یہاں پر بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''آپ (ﷺ) انہیں معاف کیا کریں''۔ یہ معاف کر دینا انسان کا شعوری فیصلہ ہونا چاہئے اور اپنے دل پر جو میل آیا ہوا سے دھو لینا چاہئے' ورنہ اس کھردری سطح پر میل جمع ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان شعوری طور پر فیصلہ کرے کہ میں نے معاف کیا' اور کوشش کر کے دل سے اس ملال کو نکال دے۔

دوسری بات فرمائی: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ''اور ان کے لئے (اللہ سے) استغفار بھی کیا کریں''۔ یہ پہلی بات کا منطقی نتیجہ ہے۔ کیونکہ کسی کے لئے اللہ سے دعا اسی وقت ہو گی جب اس کی طرف سے دل صاف ہو گا۔ اس لئے کہ دعا کا اصل جوہر درحقیقت اخلاص ہے۔ اگر اخلاص نہیں ہے تو وہ دعا نہیں ہے' بلکہ ایک رسم ہے جو پوری کر دی گئی ہے۔ جبکہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ ''پس اللہ کو پکارو اس کے لئے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے''۔ تو جب تک اس شخص کے لئے فی الواقع آپ کے دل میں یہ اخلاص پیدا نہ ہو تو چاہے آپ نے رٹے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کر دیئے لیکن استغفار کا حق ادا نہیں ہو گا۔ اس کا ایک عکس یہ بھی ہے کہ آپ استغفار کریں گے تو اس سے آپ کا دل بھی صاف ہو گا۔ تنہائی میں اگر آپ اپنے کسی ساتھی کی زیادتی پر جو اُس نے آپ پر کی ہو' اللہ سے استغفار کریں گے تو آپ کا دل میل سے بالکل صاف ہو جائے گا۔

تیسرے نمبر پر فرمایا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ﴾ ''اور معاملات میں انہیں شریکِ مشورہ کیا کریں''۔ یہاں لفظ ''امر'' وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ یہ دراصل خاص طور پر کمزور اور ضعیف ساتھیوں کے لئے حکم دیا جا رہا ہے' کیونکہ سارا پس منظر انہی کے بارے میں ہے۔ ان کے لئے نرمی ہونی چاہئے' نہ یہ کہ درشتی' سختی اور ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ ہو۔ انہیں شعوری طور پر معاف کرنا ہے' ان کے لئے استغفار کرنا ہے۔ اور پھر ایسا بھی نہ ہو کہ تمہاری نگاہ میں ان کی قدر اس طرح گر جائے کہ اب انہیں مشوروں سے خارج کر دو۔ یہ تیسرا نتیجہ نکل سکتا تھا جس کا یہاں سدباب کیا گیا کہ اعتماد کو ٹھیس نہ لگ

جائے۔اس لئے کہ انسان ہر چیز کا تاثر لیتا ہے۔ایسا شخص لازماً یہ تاثر لے گا کہ اب میں ان کی Good books میں نہیں رہا' یہ اب مجھ سے بات نہیں کرتے اور کبھی مجھ سے مشورہ نہیں کرتے۔یہ چیز ان کے دل کو آپ سے دور کرنے میں بڑی مؤثر ثابت ہوگی۔اور ظاہر ہے کہ دلوں کے فاصلے اس اجتماعیت کے ضعف کا موجب ہوں گے جو آپ اللہ کے دین کے لئے قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔لہٰذا انہیں بھی مشوروں میں شریک کیا کریں۔کسی کو مشورے میں شریک کرنا درحقیقت اس پر اظہارِ اعتماد ہے۔آدمی کو جن کے خلوص اور فہم پر اعتماد ہوتا ہے ان سے ہی وہ مشورہ کرتا ہے۔

اس ضمن میں چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ ''پھر جب آپ کسی چیز کا عزم کرلیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے!'' آپ ان کو مشورے میں ضرور شریک کیجئے' البتہ آپ پر کوئی اپنا فیصلہ ٹھونسنے والا نہیں ہے۔مشورے کے بعد فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔مشورہ اپنے نفس کے اعتبار سے ایسی چیز ہے کہ لازم نہیں کہ اس کو قبول کیا جائے۔اس لئے تمام لوگوں کو مشورے میں شریک کرنے میں کیا حرج ہے؟ البتہ اگر ووٹوں کی گنتی سے فیصلہ کرنا ہوتا تب تو آپ کو چھلنیاں لگانی ہوتیں کہ اگر سب پختہ و ناپختہ لوگوں کو مشوروں میں شریک کرلیا گیا تو غلط فیصلہ ہوسکتا ہے۔لیکن جب فیصلہ صرف امیر کے ہاتھ میں ہے تو پھر لوگوں کے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے انہیں ضرور مشوروں میں شریک کیا جانا چاہئے!

بہت سے لوگوں نے یہاں خواہ مخواہ کھینچ تان کی ہے کہ امیر کے لئے مشورہ قبول کرنا لازم ہے۔ان کے نزدیک گویا یہاں لفظ ہونا چاہئے تھا: ''فَإِذَا عَزَمْتُمْ'' شاید اللہ تعالیٰ بھول گیا (معاذ اللہ)۔اور اگر یقین ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس میں کوئی شوشا بھی یوں ہی الل ٹپ نہیں آ گیا ع

''زیر ہر ہر لفظ غالبؔ چیدہ ام میخانہ ای''

اور ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

تو پھر ماننا پڑے گا کہ ''عَزَمْتَ'' میں یہ واحد مذکر حاضر کی ضمیر بڑی فیصلہ کن ہے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ ''جب (اے نبیؐ!) آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کیجئے''۔ پھر یہ ہرگز نہ سوچئے کہ کس کی رائے مخالف تھی اور کس کی رائے حق میں تھی' اور یہ کہ اگر کسی کی رائے کے خلاف فیصلہ کر لیا تو اقامتِ دین کی گاڑی نہیں چلے گی۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے''۔ اللہ اپنے ان بندوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے معاملے کو اس کے حوالے کریں اور اسی پر توکل کریں۔ اور یہ یقین رکھیں کہ وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا' باقی کسی کی ناراضگی اور رضامندی سے اور کسی کا ساتھ دینے یا نہ دینے سے کوئی فیصلہ کن فرق واقع نہیں ہوگا۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

آیئے! وقت کو قیمتی بنایئے' خود سیکھیئے اور سکھایئے

گلی گلی کوچا کوچا دعوتِ دین پہنچایئے!
"خير الناس من ينفع الناس" بن کر اعلائے کلمۃ اللہ میں جت جایئے!
سہ روزہ' ہفت روزہ اور دیگر پروگراموں میں وقت دے کر اپنے فکر کے استحکام اور حرکی تربیت کا اہتمام کریں اور داعی الی اللہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کے لئے قبول فرمائے۔ آمین!

رفقاء واحباب دفتر حلقہ/مرکز سے رابطہ کریں۔

آپ کے جواب کے منتظر:

شعبہ دعوت و تفریغ اوقات' تنظیم اسلامی

ہندو مسلم منافرت

کی تاریخ اور اسباب کا تجزیہ

اُس کے ازالے کی اہمیت

اور

پاکستان اور بھارت کے مابین مسلسل حالتِ جنگ

کے سب سے بڑے سبب، یعنی

مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل

☆

بانیٔ تنظیم اسلامی اور داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کی دس سال قبل کی بصیرت افروز تحریریں

(ماخوذ از 'میثاق' جولائی ۱۹۹۴ء)

- تقسیم ہند: برطانوی منصوبہ یا الٰہی تدبیر؟
  اور پاک بھارت کشیدگی: انگریز کی گھناؤنی سازش
  (مطبوعہ ۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء روزنامہ ''جنگ'' و ماہنامہ ''میثاق'' لاہور جولائی ۱۹۹۴ء)
- پاکستان کا قیام: برطانوی سازش یا خدائی تدبیر؟
  (پروفیسر سید محمد یوسف عرفانی صاحب کی تحریر کے جواب میں)
- پاک بھارت کشیدگی: انگریز کی گھناؤنی سازش
- پاک بھارت مفاہمت اور مسئلہ کشمیر کا حل
- ضمیمہ بابت مسئلہ کشمیر اور اس کا حل:
  ا) بیان پریس کانفرنس۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء
  ب) اقتباس از خطاب جمعہ۔ ۴ فروری ۲۰۰۰ء
  ج) بیان پریس کانفرنس۔ ۱۰ جولائی ۲۰۰۱ء
  د) سید شہاب الدین، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا
  کے تائیدی مراسلے کا عکس۔ ۱۷ فروری ۲۰۰۰ء
  ہ) اینڈورا

(۱)

تقسیم ہند: برطانوی منصوبہ یا الٰہی تدبیر؟

اور

پاک بھارت کشیدگی: انگریز کی گھناؤنی سازش

روزنامہ جنگ لاہور کی ۲۳ر مارچ ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں صفحہ اول پر تین کالمی سرخی کے ساتھ ایک بھارتی مسلمان دانشور دانیال لطیفی صاحب کی بعض آراء پر مشتمل خبر شائع ہوئی تھی جس کی جلی سرخی یہ تھی کہ: ''قائداور گاندھی متحدہ ہندوستان چاہتے تھے' انگریز نے تقسیم پر مجبور کر دیا!'' اس کے بعد ذیلی سرخی یہ تھی کہ: ''کشیدگی ختم کرنے کے لئے وہ زہر نکالا جائے جو انگریزوں نے دوسو سال پہلے انجیکٹ کیا تھا! قائداعظم کے قریبی ساتھی اور ۱۹۴۰ء کے منشور کے مصنف سے خصوصی انٹرویو''۔ اس کے بعد نیوز رپورٹر کے حوالے سے خبر کا پورا متن حسب ذیل تھا:

''مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے منشور کے مصنف اور قائداعظم کے قریبی ساتھی دانیال لطیفی نے کہا ہے برصغیر کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم میں بندر بانٹ کی تاکہ دونوں ملک آپس میں لڑتے مرتے رہیں اور اس وقت کی سپر پاور برطانیہ دوبارہ ہندوستان پر قابض ہو جائے۔ برطانیہ کے زوال کے باعث اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کا خواب پورا نہ ہو سکا لیکن دونوں ممالک کے سیاسی لیڈر اپنے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے عوام کو گمراہ کرتے رہے۔ حقیقت کچھ اور تھی اور بتایا کچھ اور جاتا رہا۔ وہ مسلم لیگی رہنما عمر قصوری کی صاحبزادی اور سابق وفاقی وزیر خورشید قصوری کی بھتیجی کی رسم حنا کے موقع

پر ''جنگ'' کے انجم رشید' رمان احسان اور امین حفیظ پر مشتمل خصوصی پینل کو انٹرویو دے رہے تھے۔ ۷۷ سالہ بیرسٹر دانیال لطیفی نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم سے قائداعظم اور گاندھی دونوں خوش نہ تھے' مگر دونوں بے بس تھے اور یہ تقسیم قبول کرنے پر مجبور تھے۔ دونوں لیڈر متحدہ آزاد ہندوستان چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے حالات ہی ایسے بنا دیئے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا قائداعظم اسلامی سیکولر پاکستان چاہتے تھے جس میں مکمل جمہوریت ہو اور تمام مذاہب کے لوگوں کو مکمل آزادی ہو۔ انہوں نے کہا سیکولر کا آئیڈیا اسلام سے لیا گیا ہے اور قائداعظم اس سلسلہ میں اس حدیث پر یقین رکھتے تھے۔ ترجمہ: ''مظلوم کی پکار سے ڈرو' چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو''۔ انہوں نے کہا انڈیا اور پاکستان میں کشیدگی ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زہر کو نکالا جائے جو انگریزوں نے دو سو سال کے دوران دونوں قوموں کی رگوں میں ''انجیکٹ'' کیا ہے۔ دونوں ملک متحدہ ہوں یا نہ ہوں' نفرتوں کی دیوار ختم ہونی چاہئے۔ انہوں نے کہا میں قیامِ پاکستان کے وقت ہجرت کے حق میں نہ تھا۔ اس موقع پر ہونے والی لاکھوں افراد کی قتل و غارت کا ذمہ دار ماؤنٹ بیٹن تھا۔ اس نے بدمعاشی کی اور ہجرت کے بارے میں لارڈ ویول کے پلان کو تبدیل کر دیا''۔

اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا قول مبارک تو یہ ہے کہ: ''یہ نہ دیکھا کرو کہ بات کہنے والا کون ہے' بلکہ یہ دیکھا کرو کہ اس نے کہا کیا ہے!'' تاہم اس قسم کی آراء کو' جیسی کہ اس انٹرویو میں سامنے آئی ہیں' اس مسلمہ قانون کے ذیل میں شمار کیا جانا چاہئے کہ ''بعض حالات میں استثنائی مثالوں سے قاعدہ کلیہ مزید ثابت اور محکم ہو جاتا ہے''۔ لہٰذا ان آراء پر تبصرہ کرنے سے قبل ''صاحبِ رائے'' کی شخصیت کا کسی قدر تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ پاکستان کے عوام کی عظیم اکثریت نے یہ نام پہلی بار سنا ہے۔ چنانچہ خود میرا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ میں ۴۷-۱۹۴۶ء کے دوران مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا فعال کارکن تھا' یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں فیڈریشن کا جو اہم اجلاس حبیبیہ ہال' اسلامیہ کالج' ریلوے روڈ' لاہور میں منعقد ہوا تھا' جس سے

قائداعظم نے بھی خطاب فرمایا تھا: ''اس میں ضلع حصار سے شرکت کرنے والے دو مندوبین میں سے ایک میں تھا' اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں دانیال لطیفی صاحب سے بالکل واقف نہ تھا۔ تاہم چونکہ ان کی باتیں کم ازکم ''قابل غور'' ضرور نظر آئیں لہٰذا میں نے ان کے بارے میں مزید معلومات کچھ تو سینئر صحافی عبدالکریم عابد صاحب سے حاصل کیں' اور مزید لطیفی صاحب کے میزبان جناب عمر قصوری صاحب سے۔ چنانچہ ان کی آراء پر تبصرے سے قبل ان کی شخصیت کے بارے میں ان معلومات میں سے بعض کو قارئین کے علم میں لانا مناسب سمجھتا ہوں۔

میرا گمان تھا کہ جب لطیفی صاحب قصوری خاندان کی ایک شادی میں شرکت کے لئے بھارت سے پاکستان تشریف لائے تو یقیناً اس خاندان کے ساتھ ان کا عزیز داری کا تعلق ہوگا' لیکن معلوم ہوا کہ میرا یہ اندازہ غلط ہے۔ اور معاملہ صرف اتنا ہے کہ ان کی نہایت گہری ذاتی دوستی میاں محمود علی قصوری مرحوم کے ساتھ تھی' جو انہیں ان کی پوتی کی شادی کے لئے کھینچ لائی۔ ان کے والد ڈاکٹر عالم لطیفی برٹش انڈیا کے اوّلین ہندوستانی (اور وہ بھی مسلم!) فنانشل کمشنر تھے جو کچھ دیر پنجاب کے ایکٹنگ گورنر بھی رہے تھے۔ خود دانیال صاحب پکے اور سچے مارکسسٹ تھے۔ اور نہایت اعلیٰ تعلیم کے حصول حتیٰ کہ انگلستان سے بیرسٹری کی تکمیل کے بعد انہوں نے کل تیس روپے ماہانہ مشاہرے پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں ایک ''ہمہ وقت کارکن'' کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر جب عالمی کمیونزم کی سطح پر فیصلہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان کمیونسٹ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں شامل ہو جائیں تو پارٹی ڈسپلن کی پابندی کرتے ہوئے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے' اس وضاحت کے ساتھ کہ جب آپ ہمیں بھیج ہی رہے ہیں تو اب ہم وہاں پوری تندہی اور مسلم لیگ کے نظم کی پابندی کے ساتھ کام کریں گے۔ چنانچہ اپنی خداداد صلاحیت و ذہانت اور ایثار و محنت کی بنا پر دانیال صاحب قائداعظم کے قریبی رفقائے کار کے حلقے میں شمار کئے جانے لگے جس کا نمایاں مظہر یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں عام انتخابات سے قبل مسلم لیگ کا جو منشور تیار ہوا اس کے ضمن میں' جیسا کہ

اخباری خبر میں بھی وضاحت ہے (اگرچہ وہاں ۱۹۴۶ء کی بجائے غلطی سے ۱۹۴۰ء چھپ گیا ہے!) انہوں نے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ وغیرہ کے ساتھ مل کر اہم خدمت سرانجام دی۔ تقسیم ہند سے قبل بمبئی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو انہیں وہاں فسادات کی روک تھام اور بالخصوص ریلوے کے مسلمان ملازمین کی حفاظت اور امداد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب انہوں نے واپس لاہور آنے کا ارادہ کیا تو بمبئی کے مسلمانوں نے ان سے وہیں قیام کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کر لی۔ بنا بریں وہ مستقل طور پر بھارتی شہری بن گئے' بعد ازاں وہ دہلی منتقل ہو گئے اور اب وہ نئی دہلی میں سپریم کورٹ آف انڈیا میں وکالت کرتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ برعظیم پاک و ہند کے بگڑتے ہوئے حالات پر سخت مضطرب رہتے ہیں بلکہ آر ایس ایس' بی جے پی اور وی ایچ ایس قسم کی ہندو فنڈامنٹلسٹ تحریکوں سے بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو جو شدید خطرات لاحق ہیں ان کے بارے میں بہت پریشان اور متفکر ہیں۔ کمیونزم کے ضمن میں ان کا رجحان اس کے چینی برانڈ کی جانب رہا۔ اور بھارتی بنگال کے موجودہ کمیونسٹ وزیر اعلیٰ ''جیوتی باسو'' ان ہی کے رفیق اور تربیت دادہ ہیں۔ تاہم اب جبکہ عالمی سطح پر کمیونزم اور سوشلزم کی عمومی موت واقع ہو چکی ہے' ان کے نظریات میں بھی اعتدال پیدا ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم!

''صاحب رائے'' کے بارے میں اس وضاحت کے بعد اب آیئے ان کی آراء کے حسن و قبح اور صواب و خطا کی جانب۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ دنیا میں صد فی صد حق اور درست بات یا تو صرف اللہ کے اپنے کلام یعنی قرآن کی ہو سکتی ہے یا اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کی' بشرطیکہ اس کی نسبت آنجنابؐ کی جانب درست ہو۔ باقی ہر بات میں نہ صرف یہ کہ خطا و صواب اور صحیح یا غلط کا امکان بہر حال موجود ہوتا ہے' بلکہ اکثر و بیشتر معاملات میں بیک وقت دونوں ہی پہلو موجود ہوتے ہیں' صرف اس فرق کے ساتھ کہ کہیں تو خطا اور صواب تقریباً برابر موجود ہوتے ہیں' کہیں صواب اور درستی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور خطا یا غلطی کا پہلو نظر انداز کئے جانے کے قابل ہونے کی حد تک

کم' اور کہیں باطل کا عنصر غالب ہوتا ہے اور حق کا حصہ صرف اس قدر کہ باطل اس کا سہارا لے کر کھڑا ہو سکے۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جناب دانیال لطیفی کی جو آراء محولہ بالا خبر میں رپورٹ ہوئی ہیں' ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور ان کا گہرا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان میں بحیثیتِ مجموعی تو حق و باطل تقریباً برابر برابر شامل ہیں' تاہم ایک تو ان کی گفتگو کا اصل حاصل اور مقصود بالکل درست ہے' یعنی یہ کہ بھارت اور پاکستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کے کم از کم اس اضافی حصے کو تو زائل کرنے کی کوشش کی جائے جو انگریز نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت پیدا کیا تھا۔ اور دوسرے تقسیمِ ہند کے اسباب کے ضمن میں بھی اس کے باوجود کہ ان کی بعض آراء پاکستان کے عوام ہی نہیں اچھے بھلے پڑھے لکھے بلکہ دانشور شمار ہونے والے لوگوں کو بھی یقیناً نامانوس اور عجیب لگی ہوں گی' لیکن ہیں بہت حد تک صحیح! صرف اس صراحت کے ساتھ کہ ان میں ایک تو کچھ ''واقعاتی خلا'' بھی موجود ہے' اور دوسرے ایک ''ماورائی حقیقت'' سے کلی طور پر صرفِ نظر کر لیا گیا ہے اور یہ دوسری بات ایک ایسے شخص کے لئے بالکل قرین قیاس ہے جس کے ذہن پر مارکس کی جدلی مادیت کا غلبہ رہا ہو۔

چنانچہ جہاں تک گاندھی جی سمیت تمام ہندو لیڈروں یہاں تک کہ جملہ ہندو عوام کا تعلق ہے' یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کی تقسیم انہوں نے بادلِ نخواستہ بلکہ مجبوراً ہی تسلیم کی تھی۔ بلکہ ان کے اذہان اور قلوب نے اسے تا حال بھی قبول نہیں کیا ہے۔ خاص طور پر گاندھی جی کا یہ قول تو تقسیم ہند سے چند ہی ہفتے قبل کا ہے کہ ''پاکستان میری لاش پر بن سکتا ہے!'' ——— لہٰذا اس ضمن میں نہ کسی اختلاف کی گنجائش ہے' نہ بحث کی ضرورت۔

خود قائداعظم کے بارے میں دو باتیں تو قطعی مسلّم ہیں' یعنی ایک یہ کہ وہ طویل عرصے تک کانگریس میں شامل رہے تھے اور ایک زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے سفیر اور پیغامبر قرار دیئے جاتے تھے اور دوسرے یہ کہ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا جس کی رو سے ایک علیحدہ اور آزاد پاکستان

کے قیام کا معاملہ کم از کم دس سال کے لئے مؤخر ہو گیا تھا۔

ان دو نا قابل تردید حقائق کے مابین ۱۹۴۱ء میں قراردادِ پاکستان کی منظوری اور پھر اس کے مطابق تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کی عظیم جدّ و جہد میں جو ذاتی اور فیصلہ کن حصہ قائداعظم کا رہا' اس کے ضمن میں یہ بات تو کم از کم مسلمانانِ پاکستان میں مشہور و معروف ہی نہیں بلکہ تقریباً متفق علیہ ہے کہ اس کا اصل سبب قائداعظم کی ہندو ذہنیت سے مایوسی اور بیزاری تھی کہ ان سے کسی انصاف کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اور یہ رائے انہوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر قائم کی تھی اور اس کی بنا پر وہ ہر صورت میں تقسیمِ ہند ہی پر مُصر اور جازم تھے' لیکن ایک دوسری رائے بھی پیش کی جاتی رہی ہے کہ قیامِ پاکستان اور تقسیمِ ہند کا مطالبہ اصل میں ہندو قیادت کے ساتھ سیاسی سودے بازی کا مظہر تھا۔ اور قائداعظم ذہناً اور قلباً کسی بھی ایسی صورت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے جس میں ہندوستان کی وحدت بھی برقرار رہتی اور مسلمانانِ ہند کے حقوق کا مناسب تحفظ بھی ہو جاتا۔

اس مؤخر الذکر رائے کی تائید میں ایک بات' جو گزشتہ سال اتفاقاً میرے علم میں آئی' یہ ہے کہ جنوری ۱۹۹۳ء میں جب میں امریکہ جا رہا تھا تو ہوائی جہاز میں میری ملاقات پروفیسر اقبال احمد صاحب سے ہوئی جو امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس کے استاد ہیں اور امریکہ کی دوسری یونیورسٹیوں ہی نہیں دور دراز کے ممالک میں بھی سیاسی و علمی موضوعات پر خطبات کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ (ان کا تعلق اچھرہ' لاہور کے ذیلدار خاندان سے ہے!) انہوں نے بتایا کہ ان کے علم میں ایسے دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ ۱۹۴۶ء ہی میں قائداعظم نے ریاست کلو (جو اب بھارت کے ہماچل پردیش میں شامل ہے) میں خاصا وسیع رقبہ خرید فرمایا تھا تاکہ اسے ایک سیاحت کے مقام کی حیثیت سے بھی ترقی دیں' اور وہیں اپنے لئے ایک رہائش گاہ بھی تعمیر فرمائیں۔ گویا اُس وقت تک قائداعظم تقسیمِ ہند کو کوئی حتمی اور شدنی بات نہیں سمجھتے تھے۔

تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں بیرسٹر دانیال لطیفی صاحب کا نظریہ دو حصوں پر مشتمل ہے' یعنی: ایک یہ کہ نہ گاندھی جی اسے پسند کرتے تھے اور نہ قائداعظم' اور چونکہ یہی دو شخصیتیں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں فیصلہ کن حیثیت کی حامل اور قیادت وسیادت کے بلندترین منصب پر فائز تھیں لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی ناپسندیدگی کے علی الرغم جبراً مسلط کی گئی۔ لطیفی صاحب کے نظریئے کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ یہ جبر انگریزوں کی جانب سے ہوا' اور ہندوستان کی یہ جبری تقسیم ہمارے سابق حکمرانوں نے اپنے مذموم مقصد یعنی ہندوستان پر دوبارہ قابض ہونے کے لئے کی تھی!

ان میں سے پہلی بات کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتے ہوئے دوسرے حصے پر غور کیا جائے تو اس میں تو ہرگز کوئی شک نہیں کہ برعظیم کی تقسیم' اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے قیام میں ایک جزوی اور بالواسطہ عامل کی حیثیت سے انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو!'' (Divide and Rule) کی حکمتِ عملی کا کسی نہ کسی حد تک عمل دخل موجود تھا' لیکن اسے ایک کلی حقیقت یا واحد سبب قرار دینے کے لئے ایک جانب تو جس قدر مثبت شواہد کی ضرورت ہے وہ موجود نہیں ہیں۔ اور دوسری جانب' جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا تھا' ایک اہم ''واقعاتی خلا'' بھی اس کی راہ میں حائل ہے۔

یہ بات تو یقیناً اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا اصل سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بڑھتی ہوئی بے اعتمادی اور نفرت تھی۔ البتہ اس باہمی منافرت اور بداعتمادی کے بارے میں جہاں یہ کہنا غلط ہے کہ یہ کُل کی کل انگریز کی پیدا کردہ تھی' وہاں یہ کہنا بھی حقائق سے گریز کے مترادف ہے کہ اس کی شدت اور گہرائی و گیرائی میں کوئی اضافہ انگریزوں کی مذکورہ بالا حکمت عملی سے نہیں ہوا۔

جہاں تک اس ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی کا تعلق ہے وہ اوّلاً تو بجائے خود حاکم و قابض اقوام کے ان مسلّمہ ہتھکنڈوں میں سے ہے جو علامہ اقبال نے سورۃ النمل کی آیت ۳۴ کے حوالے سے بیان کئے ہیں' یعنی۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ "اِنَّ الْمُلُوْکَ"
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ثانیاً اس کے ضمن میں حقائق وشواہد کا کافی مواد بھی خان عبدالولی خان صاحب انڈیا آفس کے ریکارڈ کی چھان بین اور تحقیق وتفتیش کے ذریعے وقتاً فوقتاً فراہم کرتے رہے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کے بعض دانشوروں نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفرت کے ''چلتے ہوئے جھکڑ'' اور بداعتمادی کی ''اٹھتی ہوئی آندھی'' کے ایک سبب کو اس درجہ اچھالا ہے' اور اس شدت کے ساتھ تحریر وتقریر کا موضوع بنایا ہے کہ دوسرے جملہ عوامل نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ عوام کے اذہان میں اس پوری صورت حال کے واحد سبب کی حیثیت صرف ہندوؤں کی عمومی چھوت چھات' برہمنوں کے سامراجی مزاج اور بنیوں کی چاپلوسانہ عیاری کی ذہنیت کو حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک جانب یہ پہاڑ جیسی عظیم حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی کہ ہندو معاشرہ صرف برہمنوں اور بنیوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں راجپوت اور شودر بھی موجود ہیں' جو اپنا اپنا جداگانہ مزاج رکھتے ہیں' مزید برآں خود برہمنوں اور بنیوں میں بھی ۔ ''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد ـــــ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!'' کے مصداق ہر مزاج اور کردار کے لوگ موجود ہیں اور دوسری جانب ان دو اہم عوامل سے تو کامل ذہول ہو گیا جن میں سے ایک کا تعلق ماضی بعید اور خود مسلمانوں کے اپنے کردار سے ہے' اور دوسرے کا ماضی قریب اور انگریزوں کے کردار سے!

ان میں سے مقدم الذکر سے صرفِ نظر اور غضِ بصر کا معاملہ تو

''وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!''

کے عین مطابق ہے۔ اس لئے کہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف بہت مشکل ہے کہ خود ہم مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی ''ہزار سالہ'' حکومت کے دوران اکثر و بیشتر وہی ''اقوامِ غالب'' والا کردار اختیار کیا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنے ان فرائض کو تو سرے سے ادا ہی نہیں کیا تھا جو اُمت مسلمہ اور اُمت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتے تھے' یعنی اللہ کے پیغام کی دعوت و تبلیغ اور اسلام کے عادلانہ نظامِ زندگی اور دینِ حق کے نظامِ عدل وقسط کے قیام کے ذریعے خلق خدا پر اللہ کی رحمانیت و رحیمیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کا عملی مظاہرہ' اور اس طرح اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے ہندوستان میں بسنے والوں پر اتمامِ حجت! بلکہ بہت سے حکمرانوں نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے علاوہ ذاتی عیاشی اور بوالہوسی کے وہ جملہ انداز اختیار کئے جو ہمیشہ سے ملوکیت اور بادشاہی کے لوازم میں سے رہے ہیں اور ان سب کی بنا پر ہندوؤں میں عمومی طور پر وہ انتقامی جذبہ موجود تھا جو سقوطِ ڈھاکہ کے حادثۂ فاجعہ کے موقع پر ع ''نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں!'' کے مطابق فتح مندی کی سرمستی میں پنڈت موتی لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی پوتی اور جواہر لال نہرو جیسے سیکولر اور سوشلسٹ مزاج کے حامل شخص کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے ظاہر ہو گیا کہ:

''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!''

بہر حال وہ آگ جو ان دو عوامل یعنی برہمن اور بنیا ذہنیت اور مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے ردِعمل نے بھڑکائی تھی اس پر تیل کا کام یقیناً اس تیسرے عامل یعنی انگریزوں کی حکمت عملی نے سرانجام دیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ٹھیک وہی کام کیا جو سورۃ النمل کی آیت ۳۴ میں بیان ہوا ہے' یعنی مفتوح قوم کے اعلیٰ طبقات کو ادنیٰ (اور ادنیٰ کو اعلیٰ) بنا دیا جائے' چنانچہ ہمارے سابق حکمرانوں نے سوائے پنجاب اور سرحد

کے باقی پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو دبایا اور ہندوؤں کو ابھارا۔ اور پھر ان دونوں کے مابین چپقلش کو مسلسل ہوا دی اور نفرت اور بے اعتمادی کے جراثیم کو پروان چڑھایا جسے دانیال لطیفی صاحب نفرت کو ''انجیکٹ'' کرنے سے تعبیر کر رہے ہیں!

بہر حال' اس عامل کی حد تک تو تقسیمِ ہند کے ضمن میں انگریزوں کا حصہ لازماً تسلیم کیا جانا چاہئے' لیکن اسے واحد یا سب سے فیصلہ کن عامل قرار دینا ہرگز صحیح نہیں ہے' جیسا کہ دانیال صاحب کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کی راہ میں جو سب سے بڑا ''واقعاتی خلا'' حائل ہے وہ یہ کہ انگلستان میں دو جماعتی پارلیمانی جمہوریت قائم تھی جس میں عام طور پر مخالف سیاسی جماعتوں کے بنیادی مزاج اور عمومی طرزِ عمل میں اختلاف موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ کنزرویٹو پارٹی اور لیبر پارٹی کے مزاج اور پالیسیوں میں بھی بہت فرق اور تفاوت تھا۔ اور ''لڑاؤ اور حکومت کرو!'' کی حکمت عملی مقدم الذکر کی حد تک تو ایک حقیقتِ موضوعہ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن مؤخر الذکر کے ضمن میں کم از کم اس حد تک نہیں۔ اور یہ بات کہ جب ہندوستان آزاد ہوا اس وقت انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار تھی جہاں اس اعتبار سے اہم ہے کہ بصورت دیگر شاید ابھی آزادی کے حصول میں تاخیر ہو جاتی' وہاں مسئلہ زیر بحث کے اعتبار سے تو نہایت فیصلہ کن ہے۔ اس لئے کہ پہلے بھی یہ راز کچھ ایسا زیادہ خفیہ نہ تھا اور اب تو وہ طشت از بام بھی ہو چکا ہے کہ انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ ایٹلی' اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن دونوں کو قائداعظم اور مسلم لیگ سے شدید نفرت تھی۔ چنانچہ یہی وہ معروضی صورت حال تھی جس کے پیشِ نظر قائداعظم کو کیبنٹ مشن پلان قبول کرنا پڑا تھا' جس کے نتیجے میں کم از کم فوری طور پر ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مسئلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کے بعد بھی ملک تقسیم ہوا اور ایک آزاد اور خود مختار پاکستان وجود میں آیا تو یہ ''جبر'' تو لازماً تھا لیکن انگریز کا نہیں' بلکہ اس سے بھی کہیں بالاتر اور مقتدر ہستی یعنی اللہ کا! چنانچہ یہی وہ ''ماورائی'' حقیقت ہے جس کی جانب مارکس کی جدلی مادیت کے پھندے میں گرفتار شخص کا ذہن منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ''جبر'' اور قانونِ الٰہی کی یہ کارفرمائی اس سنت اللہ کے مطابق ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے لئے آزادی کی طالب ہوتی ہے تو اللہ اس کی خواہش پوری فرما کر اسے ایک لازمی آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے کہ آزادی و خود اختیاری کے حصول کے بعد وہ اپنا وعدہ پورا کرتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ قرآن کے اس عمومی اسلوب کے مطابق کہ اہم مضامین اس میں کم از کم دو بار ضرور بیان ہوتے ہیں' یہ قانونِ الٰہی بھی سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۹ (۱) میں تو خاص طور پر بنی اسرائیل کی سرگزشت کے ضمن میں وارد ہوا ہے۔ اور سورۂ یونس کی آیت ۱۴ (۲) میں عمومی انداز میں مذکور ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام' جس کے لئے تقسیم ہند ناگزیر تھی' سیاست وعمرانیات کے جملہ اصولوں کی رو سے ایک ''معجزہ'' کی حیثیت رکھتا ہے جس کی واحد توجیہہ صرف مذکورہ بالا سنتِ الٰہی ہی سے ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ جب راس کماری سے درۂ خیبر' اور چاٹگام سے کوئٹہ تک پورا برِ عظیم ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' کے نعروں سے گونج اٹھا اور جمعوں اور عیدوں کی نمازوں میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کی گئیں کہ ''اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندوؤں کی دوہری غلامی سے نجات عطا فرما' تاکہ ہم تیرے نبیؐ کے دین پر عمل پیرا ہو سکیں!'' چنانچہ حکمت خداوندی نے عین لیلۃ القدر کو تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا فیصلہ صادر فرما دیا'' تاکہ ہم دیکھیں کہ اب تم کیا عمل کرتے ہو''۔ (یونس:۱۴)

اب ظاہر ہے کہ تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کا یہ ''ماورائی عامل'' کسی ایسی شخصیت ہی کو نظر آ سکتا تھا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ ع ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!'' چنانچہ یہ علامہ اقبال تھے جنہوں نے ۱۹۳۰ء ہی میں' جب کہ ابھی قائداعظم تو صرف چودہ نکات تک ہی پہنچے تھے' اس ''تقدیرِ مبرم'' کا ''مشاہدہ'' کر لیا تھا کہ ''ہندوستان کے شمال

(۱) ﴿قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰي رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝﴾

(۲) ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝﴾

مغربی حصے میں ایک آزاد مسلم ریاست قائم ہو گی!'' یہ دوسری بات ہے کہ اس مردِ درویش نے اس کا جو اصل مقصد معین کیا تھا اس کی جانب تا حال کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ تاہم اس سے بھی کوئی حرف حضرت علامہ پر نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہ بات انہوں نے ایک امکان اور ''موقع'' کی حیثیت سے کہی تھی' پیشین گوئی کے انداز میں نہیں کہ: ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اس کے اصل روئے روشن کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں!'' ـــــ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو بعض احادیثِ نبویہؐ کی بنیاد پر یہ یقین حاصل ہے کہ ان شاء اللہ علامہ اقبال کی یہ توقع بھی پوری ہو گی اور خلافتِ اسلامی کا احیاء اسی ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان سے ہو گا۔ اگرچہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۹ میں وارد شدہ الفاظ: ﴿وَاِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ ''اور اسی طرح سورۃ الجن کی آیت ۲۵ میں وارد شدہ الفاظ مبارکہ: ﴿قُلْ اِنْ اَدْرِیْ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْ اَمَدًا ۝﴾'' یعنی ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی میرا ربّ اس میں کچھ دیر فرمائے گا!'' کے مطابق نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرحلہ ابھی کتنی دور ہے' نہ یہ کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اب تک کی وعدہ خلافی کی مزید سزا دے گا یا نہیں' اور دے گا تو کیا!

بہر حال جہاں تک دانیال لطیفی صاحب کی اس رائے کا تعلق ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین نفرت کا خاتمہ کیا جائے تو اس کے ضمن میں عرض ہے کہ اگر فوری طور پر اس کا کلی خاتمہ ممکن نہ ہو تو بھی آزادی کے چھیالیس سال [1] بعد ہمیں اس امر پر تو سنجیدگی کے ساتھ لازماً غور کرنا چاہئے کہ اس کے کم از کم اس اضافی حصے کو تو ختم کرنے کی بہر صورت کوشش کریں جو ہمارے سابق غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی وقتی حکمت عملی کے تحت پیدا کیا تھا۔ کاش کہ دونوں ملکوں کے دانشور اس جانب توجہ کر سکیں۔

---

(۱) واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۹۴ء کی ہے۔

(۲)

پاکستان کا قیام:

برطانوی سازش یا خدائی تدبیر؟

پروفیسر سید عرفانی کے جواب میں

روزنامہ ''جنگ'' لاہور کی اشاعت ۱۶ اور ۱۷ مئی ۱۹۹۴ء میں میرے اس کالم پر ایک تنقیدی تحریر سید محمد یوسف عرفانی صاحب کے قلم سے شائع ہوئی ہے جو ۲۲ اپریل کو ''قیامِ پاکستان: برطانوی سازش یا الٰہی تدبیر؟'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ میں شخصی اعتبار سے پروفیسر صاحب سے بالکل واقف نہیں ہوں، علم و فضل میں تو وہ یقیناً مجھ سے زیادہ ہیں، ہوسکتا ہے کہ عمر میں بھی زیادہ ہوں۔ بنابریں ان کے ''استفسار'' کے جواب میں اگر کوئی لفظ نادانستہ طور پر میرے قلم سے ایسا نکل جائے جس میں سوءِ ادب کا احتمال ہو تو پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

مجھے سخت حیرت اور تعجب ہے کہ دو اقساط پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں میری گزارشات کے اس حصے کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو نہ صرف یہ کہ میرے اصل مدّعا اور مقصود کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس کالم کے عنوان میں بھی جلی طور پر شامل ہے، یعنی: ''الٰہی تدبیر!'' مزید برآں پروفیسر صاحب نے جناب دانیال لطیفی کے پورے موقف کو میری جانب منسوب کر دیا ہے، یعنی یہ کہ تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان اصلاً برطانوی سازش کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ میں نے اس کے صرف ایک جزو کے مبنی برصداقت ہونے کے احتمال کو تسلیم کر کے کلی اور مجموعی طور پر اس کی پرزور تردید اور نفی کی ہے، اور اس تردید اور نفی کے

ضمن میں بعینہٖ وہی دلیل دی ہے جو خود پروفیسر صاحب نے اپنی تحریر کے آخر میں بیان فرمائی ہے۔ اس پر اگرچہ صحیح طرزِ عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ ؎ ''ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے'' اور ''خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!'' کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جائے' لیکن چونکہ ہوسکتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی اس تحریر سے بہت سے قارئین کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہوں لہٰذا میں اپنا موقف دوبارہ اختصار کے ساتھ لیکن ریاضی کے سے انداز میں سلسلہ وار درج کر رہا ہوں:

۱) میرے نزدیک پاکستان کا قیام کسی برطانوی سازش کا نتیجہ ہرگز نہیں تھا بلکہ اللہ کی حکمت ومشیت کا مظہر' اور احیاءِ اسلام اور غلبۂ دینِ حق یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے عالمی سطح پر قیام کے ضمن میں اللہ کے طویل المیعاد منصوبے کی اہم کڑی ہے۔

۲) تقسیمِ ہند کے سلسلے میں ''برطانوی سازش'' کے عمل دخل کا احتمال جزوی اور بالواسطہ طور پر اس اعتبار سے تو یقیناً ہے کہ عالمِ اسباب میں اس کا اصل سبب یہی بنا کہ مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کی جانب سے ناانصافی اور استحصال ہی نہیں' اپنے جداگانہ ملی و قومی تشخص کے بالکلیہ خاتمے کا شدید ''خوف'' لاحق ہو گیا تھا اور اس صورت حال کے پیدا ہونے میں جہاں بنیادی طور پر ہندوؤں (بالخصوص برہمنوں اور بنیوں) کے عمومی مزاج اور مسلمانوں کی طویل غلامی سے پیدا شدہ ردعمل کو بھی دخل حاصل تھا' وہاں یقیناً انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو!'' کی حکمتِ عملی نے بھی اس جلتی آگ پر تیل کا کام کر کے اس کی شدت اور اشتعال کو بڑھانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اور اگر تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے وقت برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی کی حکومت ہوتی جس کی پالیسی میں اس ''لڑاؤ اور حکومت کرو!'' کی حکمتِ عملی کو اصولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور جس کے دستاویزی شواہد خان عبدالولی خان وقتاً فوقتاً پیش فرماتے رہے ہیں' تو شاید اس مفروضے کی تردید مشکل ہو جاتی کہ قیامِ پاکستان برطانوی سازش ہی کا نتیجہ ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور اختیارِ مطلق سے اپنی ''تدبیر'' کے ضمن

میں اس مغالطے کا کلی سدباب اس طور سے کر دیا کہ تقسیم ہند کا فیصلہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت کے ہاتھوں کروایا جس کے لیڈروں کی مسلمانانِ ہند سے بالعموم اور مسلم لیگ اور اس کے قائد محمد علی جناح سے بالخصوص عداوت اور دشمنی اظہر من الشمس تھی! (چنانچہ یہی دلیل میں نے اپنے کالم میں بھی دی تھی' اور اسی پر پروفیسر عرفانی صاحب کے استدلال کی تان بھی ٹوٹی ہے!)

۳) اوپر احیاءِ اسلام' غلبۂ دینِ حق اور عالمی نظامِ خلافت کے قیام کے جس طویل المیعاد خدائی منصوبے کا ذکر ہے' راقم کے نزدیک اس کا آغاز ''الف ثانی'' یعنی اُمت مسلمہ کی تاریخ کے دوسرے ہزار سال کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ (اگرچہ یہ صرف اللہ ہی کے علم میں ہے کہ اس کی آخری اور حتمی ''تکمیل'' میں ابھی مزید کتنی مدت باقی ہے!) چنانچہ عالمِ واقعہ میں اس منصوبے کی تعمیل کے ضمن میں جن اعاظم رجال کی محنتوں اور کاوشوں نے اہم ترین اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ان میں سرفہرست تو گیارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانیؒ ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ؎

''وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!''

البتہ بعد کی دو صدیوں کے دوران اس خاکے میں ہمارے بہت سے بزرگوں نے اپنے خون اور پسینے سے رنگ بھرا اور اس منصوبے کو درجہ بدرجہ آگے بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کیا' لیکن چودھویں صدی ہجری میں اس منصوبے کی اہم کڑی یعنی قیامِ پاکستان جن دو عظیم اشخاص کی مساعی کا مرہونِ منت ہے وہ ہیں علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح۔ جن کے مابین مثالی اتحاد و اتفاق اور عمومی ہم آہنگی اور باہمی تعاون کے باوصف سوچ اور ''اپروچ'' کا ایک لطیف فرق بھی موجود ہے۔

۴) چنانچہ علامہ اقبال اصلاً ایک مفکر اور فلسفی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک ''وژنری'' تھے اور ان کی اصل دلچسپی فکر اسلامی کی تجدید اور اس کے نتیجے میں نظام

اسلام اور ملتِ اسلامی کے احیاء سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں انہوں نے تقسیمِ ہند یا مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کی کوئی ''تجویز'' پیش نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ ''پیشین گوئی'' فرمائی تھی کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام ''تقدیرِ مبرم'' ہے اور اپنی اس دلی آرزو کا اظہار کیا تھا کہ ''اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو بدنما پردے عرب ملوکیت (ان کے اپنے الفاظ میں ''عرب امپیریلزم'') کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کا اصل رخِ روشن دنیا کے سامنے پیش کر سکیں'' یعنی اسلام کے اصل نظامِ عدلِ اجتماعی یا بالفاظِ دیگر نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کو دوبارہ دنیا میں قائم کریں۔ جبکہ قائداعظم کو اصل فکر مسلمانانِ ہند کے قومی تشخص کے بقاء اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کی حفاظت کی تھی جس کے لئے وہ کسی بھی قابلِ عمل منصوبے اور دستوری و آئینی تجویز پر غور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ چنانچہ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کے ضمن میں وہ ہندو قوم کے عمومی مزاج اور انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت کے طرزِ عمل سے رفتہ رفتہ اور تدریجاً ہی مایوس ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان کو' جو اصلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن کی پیداوار تھا' قائداعظم نے قبول کیا تو جہاں یہ اس اعتبار سے ان کے سیاسی فہم و تدبر کا شاہکار تھا کہ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کے تبدیل شدہ عالمی حالات کے پیش نظر برطانوی حکومت ہندوستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس موقع پر اگر ہم نے کسی نامناسب ضد یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو عین ممکن ہے کہ انگریز ہندوستان کی حکومت یک طرفہ طور پر کانگریس کے حوالے کر کے چلتے بنیں اور پھر یہ عقدۂ لاینحل بن جائے (اس پر مفصل بحث میں نے اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان'' میں کی ہے!) وہاں اس احتمال کی بھی کلی نفی نہیں کی جا سکتی کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تقسیمِ ہند ہی ہندو مسلم مسئلے کا واحد ممکن حل نہیں تھا' بلکہ وہ ایسی کسی بھی تجویز پر غور کرنے کے لئے کھلے دل اور ذہن کے ساتھ تیار تھے جس کے ذریعے مسلمانانِ ہند کے قومی تشخص

کے بقاء اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کی حفاظت کی ضمانت حاصل ہو سکے! چنانچہ اس اعتبار سے جناب دانیال لطیفی کا خیال اور پروفیسر اقبال احمد کی بتائی ہوئی بات قابلِ غور تو ہے ہی جزوی طور پر درست بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم! بہرحال میری جانب سے ان کا حوالہ صرف اس حد تک تھا۔ جناب دانیال لطیفی کے تمام خیالات کو میرے سر مڑھ دینا بہت بڑی زیادتی ہی نہیں علمی خیانت ہے!

۵) تاہم میرے نزدیک اب ہمارے لئے اصل قابل غور چیز یہ تاریخی مباحث نہیں بلکہ یہ نہایت تلخ حقیقت واقعی ہے کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں علامہ اقبال کی پیشین گوئی کے پورے ہو جانے پر لگ بھگ پونے سینتالیس سال (اور قمری حساب سے سوا اڑتالیس سال) گزر جانے کے بعد بھی اپنی کوتاہیوں اور بے عملی ہی نہیں بدعملی کے باعث ہم نہ ان کی اس آرزو کی طرف کوئی پیش قدمی کر سکے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کے عادلانہ نظامِ عدل اجتماعی کو بالفعل قائم کر کے (اور قائداعظم کے الفاظ میں: ''اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک عملی نمونہ پیش کر کے'') نوعِ انسانی پر اللہ کے دینِ حق اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی عالمی نبوت ورسالت کی جانب سے ''اتمامِ حجت'' کر سکیں اور نہ ہی قائداعظم کے اس خواب کی تعبیر دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب ہو سکے ہیں کہ تقسیمِ ہند کی صورت میں پاکستان اور بھارت کے مابین تعلقات اسی نوعیت کے ہوں گے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مابین ہیں' بلکہ اس کے برعکس ہم نے اپنے طرزِ عمل سے تا حال تو یہی ثابت کیا ہے کہ تقسیمِ ہند کے ضمن میں جو اندیشے نیشنلسٹ مسلمانوں کو بالعموم اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو بالخصوص لاحق تھے وہ درست ثابت ہوئے۔ اب اگر حکیم سعید صاحب (۱) نے پاکستان کے موجودہ عمومی حالات کا آئینہ نہایت دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ دیا ہے تو اس پر آئینہ کو توڑ دینے اور آئینہ دکھانے والے پر ٹوٹ پڑنے کی بجائے بہتر روش یہ ہے کہ حالات کو سنوارنے اور اس ملک کے قیام سے جو اصل مقاصد اس

(۱) حکیم محمد سعید شہید' مرحوم ومغفور' بانیٔ ہمدرد دواخانہ پاکستان

کے مصور و مفکر و مجوز (علامہ اقبال) اور بانی و معمار و مؤسس (قائداعظم) کے پیش نظر تھے ان کے حصول کی جانب پیش قدمی کی جائے!

۶) اسی طرح اگر حکیم صاحب موصوف کی تحریر کو' جو اوّلاً ''نظریۂ پاکستان'' کے سب سے بڑے دعوے دار روزنامے میں شائع ہوئی تھی' میں نے بھی تحریکِ خلافت پاکستان کے نقیب جریدے ''ندائے خلافت'' میں اس لئے شائع کر دیا کہ چونکہ حکیم صاحب ایک غیر سیاسی اور غیر متنازعہ شخصیت ہیں' لہٰذا شاید کہ ملک و قوم کے ناگفتہ بہ حالات پر ان کا دردمندانہ ''مرثیہ'' کچھ لوگوں کو اصلاحِ حال کے لئے کمربستہ کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکے' تو اس کی بنا پر مجھے ابوالکلام آزاد مرحوم یا مولانا مدنیؒ کا معتقد اور مرید' بلکہ ایجنٹ قرار دے دینا بھی کسی طرح مبنی بر عدل و انصاف نہیں ہے! جبکہ میں نے ہزار بار اعلان کیا ہے کہ مجھے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک والے ابوالکلام آزاد سے تو بے حد دلچسپی ہے جس نے پہلے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' ایسے جرائد اور پھر ''حزب اللہ'' کے قیام کے ذریعے اسلامیانِ ہند کے اس ملی و دینی جذبے کو جو اصلاً علامہ اقبال کی ملی شاعری سے پیدا ہوا تھا' ایک دعوت' تحریک اور تنظیم کی اوّلین صورت عطا کی اور اس اعتبار سے میں انہیں برملا اپنا ''دادا پیر'' تسلیم کرتا ہوں' لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد والے ''نیشنلسٹ ابوالکلام'' سے مجھے کوئی دلچسپی تو کیا سرے سے بحث ہی نہیں ہے۔ اسی طرح مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں بھی میں نے بار بار وضاحت کی ہے کہ میں اُن کے دینی علم و فضل اور تقویٰ و تدین پر مستزاد انگریز کے خلاف ان کے سرفروشانہ جہادِ حریت کا تو یقیناً قائل بھی ہوں اور اس کی بنا پر ان سے ایک گونہ محبت اور عقیدت بھی رکھتا ہوں' لیکن ان کی سیاسی حکمت عملی سے نہ صرف یہ کہ شدید اختلاف رکھتا ہوں بلکہ اسے ان کے استاذ اور مربی اور میرے نزدیک چودھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مجتہدانہ بصیرت کے بھی خلاف سمجھتا ہوں جو اُن کے ۱۹۲۰ء کے بعض خطبات سے ظاہر ہوتی ہے (اس موضوع پر مفصل بحث میری تالیف ''جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی'' میں موجود ہے!) ـــــ تاہم اس اختلاف کے

باوجود میں ہرگز نہ انہیں ہندوؤں کا زرخرید سمجھتا ہوں نہ مولانا ابوالکلام آزاد کو' بلکہ دونوں کو اپنی رائے اور موقف میں مخلص سمجھتا ہوں اور اس پر اگر کوئی مجھے گردن زدنی قرار دے تو مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہے!

۷) پروفیسر عرفانی صاحب نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۱ اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۹ کے حوالے سے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ تو 'گستاخی معاف' ان کی ''سخن فہمی'' کے بارے میں کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں کرتیں' اس لئے کہ ان دونوں آیات میں صراحت کے ساتھ تذکرہ صرف یہود اور نصاریٰ کا ہے۔ گویا ان آیات کا مدلول اور مدّعا یہودیوں اور عیسائیوں کے حق میں تو ''نصِ قطعی'' کی حیثیت رکھتا ہے' جبکہ ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے ضمن میں ان کا اطلاق فرمانِ نبویؐ ((اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ)) سے استنباط کے ذریعے ثانوی درجہ میں ہوگا۔ لہٰذا ان آیاتِ مبارکہ سے تو میرے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ ہمیں اب عالمی صہیونیت کے آلۂ کار امریکہ' اور اس کے خانہ ساز ادارے بلکہ خانہ زاد کنیز اقوامِ متحدہ سے صرفِ نظر کر کے مشرقی ایشیا کے مسلم ممالک یعنی ایران' افغانستان' ترکستان' اور ان کے علاوہ بھارت اور چین کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے۔ رہا ان کا یہ فرمانا کہ: ''امریکہ پاکستان اور برصغیر سے کوسوں دور ہے لہٰذا وہ برصغیر پر مادی تسلط قائم نہیں کر سکتا!'' تو یہ ان کے موجودہ عالمی مالیاتی نظام اور اس کے اثر و نفوذ سے ناواقفیت نہیں تو ان تلخ حقائق کی جانب سے صرفِ نظر کا ضرور مظہر ہے۔ اس لئے کہ آج کی دنیا میں اگرچہ فاصلے بھی بے معنی ہو گئے ہیں' تاہم کسی مادی تسلط یا عسکری قبضہ اور براہِ راست حکومت کے کھکھیڑ مول لینے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی ہے' جبکہ ورلڈ بینک' اور آئی ایم ایف ایسے اداروں کے ذریعے پوری دنیا پر ریموٹ کنٹرول کی صورت میں بالواسطہ حکومت بھی کی جا سکتی ہے اور سودی معیشت اور قرضوں کے جال میں پھنسا کر دور بیٹھے اور عوامی غیظ و غضب سے کلی طور پر محفوظ رہتے ہوئے قوموں اور ملکوں کی خون پسینے کی کمائی کی بالائی بھی بآسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔

۸) ''آخری لیکن کمترین نہیں'' کی مصداق وضاحت یہ ہے کہ یہ مجھ پر بہت بڑا بہتان ہے کہ میں پاکستان اور بھارت کے مابین سرحدوں کی دیوار کو گرانا چاہتا ہوں۔ میری تو پوری زندگی کی سعی و جہد کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کر کے اوّلاً خود اسے مستحکم کیا جائے اور پھر اس انقلاب کی مشرق و مغرب میں توسیع کے ذریعے خدا کی مخلوق کو انسانی ذہن کے تراشیدہ ظالمانہ اور استحصالی نظاموں سے نجات دلا کر ''رَبُّ النّاس' الٰہ النّاس اور ملکُ النّاس'' کے عادلانہ اور منصفانہ نظامِ اجتماعی کی نعمت سے بہرہ ور کیا جائے۔ البتہ بھارت اور پاکستان کے مابین مخاصمت اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین منافرت میں کمی کی ہر کوشش میرے نزدیک نہ صرف اصولی اور اخلاقی اعتبار سے مستحسن ہے بلکہ مفکر و مصورِ پاکستان اور بانی و مؤسس پاکستان دونوں کے نظریات کے بھی عین مطابق ہے!

قرآن کی عظمت

اور اس کی بنیادی تعلیمات

ابوظہبی پروگرام-1985

مقرر: **ڈاکٹر اسرار احمد**

(بانی تنظیم اسلامی)

اب VCDs میں دستیاب ہیں

عنوانات

عظمت قرآن — راہ نجات — حقیقت ایمان

عمل صالح — تواصی بالحق — تواصی بالصبر

حقیقت نفاق — حقیقت واقسام شرک — اقامت دین

کل سی ڈیز : 21

قیمت فی سیٹ : -/840 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

36۔ ... 5869501-03

(۳)

پاک بھارت کشیدگی:
انگریز کی گھناؤنی سازش

انگریزوں نے برعظیم پاک و ہند کے بعض حصوں پر ایک سو برس سے کچھ زائد اور بعض پر لگ بھگ دو سو برس تک حکومت کی اور عجیب اتفاق ہے کہ مقدم الذکر علاقہ کا جزو اعظم موجودہ پاکستان ہے' اور مؤخر الذکر کا اہم ترین حصہ مشرقی پاکستان تھا جو اَب بنگلہ دیش کی صورت میں موجود ہے۔ بہرحال اس عرصے کے دوران ہندوستان میں بسنے والوں کی چار پانچ سے لے کر آٹھ دس نسلوں تک انگریزوں کی غلامی میں گزریں۔ اب عمرانیات اور اجتماعی نفسیات کا عام قاعدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی ملک پر کوئی بیرونی قوم اس طرح اور اتنے عرصے تک قابض و حاکم رہے تو طبعی طور پر محکوم قوم میں اس کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے' جو حصولِ آزادی کے وقت تو لازمی طور پر شدید ترین ہوتا ہے' خواہ بعد میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس میں کمی واقع ہو جائے۔ لیکن یہ ایک عجیب استثنائی معاملہ ہے کہ عین حصولِ آزادی اور تقسیمِ ہند کے وقت بھی انگریزوں کے خلاف نفرت نہ ہندوستان کے ہندوؤں میں تھی نہ مسلمانوں میں۔ بلکہ بڑے ملک یعنی بھارت نے تو آخری انگریز وائسرائے لاؤڈ بیٹن ہی کو اپنا پہلا گورنر جنرل بھی بنا لیا تھا اور یہی معاملہ پاکستان کا بھی ہو جاتا اگر قائداعظم ماؤنٹ بیٹن کی اس خواہش کو بلا جھجک رد نہ کر دیتے اور یہ بھی میرے نزدیک یقیناً اس خدائے بزرگ و برتر کی خصوصی مشیت ہی کے تحت ہوا' جس کی شان یہ ہے کہ: ﴿وَاللّٰہُ لَا

يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ ﴾ (الاحزاب:۵۳) یعنی ''اللہ کو حق بات کے کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی!'' ورنہ کون نہیں جانتا کہ اس صورت میں پاکستان کا بسترع ''اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے'' کے مصداق دراز ہوتے ہی تہہ ہو جاتا۔ مزید برآں یہ واقعہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ بعد میں بھی دونوں ملک طویل عرصے تک برطانیہ عظمیٰ کے زیر سرپرستی دولت مشترکہ میں شامل رہے اور کافی عرصہ کے بعد ایک جذباتی مرحلے پر پاکستان نے اسے خیر باد کہا بھی تو بہت جلد اس پر اس کی جانب سے پچھتاوے کا اظہار ہوا۔

لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ ع ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا!'' کے مصداق اس کا سبب کیا ہے؟۔

اس ضمن میں جہاں تک عین آزادیٔ ہند اور تقسیم ملک کے وقت کا تعلق ہے اس میں تو ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ ع ''یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں!'' کے مصداق دونوں قوموں میں نفرت و انتقام کے جملہ جذبات ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی کشت وخون کی صورت میں ڈھل کر تحلیل ہو گئے اور سابق حاکم یعنی انگریز محکوم ہندوستانیوں کے اس طبعی ردّعمل سے صاف بچ کر نکل گئے۔ البتہ اس ہندو مسلم منافرت اور بداعتمادی کے آغاز اور ارتقاء کے مختلف اسباب وعوامل اور ان کے مابین باہمی نسبت وتناسب کے بارے میں آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مجموعی اعتبار سے تو جملہ اسباب وعوامل غالباً متفق علیہ ہی ہوں گے' تاہم ان کے تجزیئے کے ذریعے یہ تعین کرنا کہ ان میں سے کون سا عامل سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا بہت گہری تحقیق وتفتیش کا محتاج ہے۔

ہندو مسلم منافرت کے وہ ممکنہ متفق علیہ عوامل حسب ذیل ہیں:

۱) ہندوؤں کی عمومی تنگ نظری اور الگ تھلگ رہنے کا انداز' خصوصاً ان کا چھوت چھات کا نظام۔

۲) برہمن کا سامراجی مزاج اور ویش اور کھتریوں کی چاپلوسانہ عیاری اور سود خوری کی

وہ عادت جس کی بنا پر بنجمن فرینکلین نے یہودیوں کو خون چوسنے والی چمگادڑوں (vampires) سے تعبیر کیا تھا۔

۳) مسلمانوں کی ''ہزار سالہ'' غلامی کا طبعی ردعمل۔ اور ''آخری لیکن کمترین نہیں'' کے مصداق

۴) انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی حکمتِ عملی جو کنزرویٹو پارٹی کی تو یقیناً عادتِ ثانیہ تھی' البتہ لیبر پارٹی میں اتنی راسخ نہ تھی!——

بہرحال ان میں سے کون سا عامل اہم ترین اور مؤثر ترین تھا اور ان میں سے ہر ایک کا جدا جدا حصہ کتنا تھا' اگرچہ اس سوال کے واضح اور حتمی جواب کو فی الحال مستقبل کے محققین اور مؤرخین کے حوالے کیا جا سکتا ہے' تاہم اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کم از کم برٹش راج کے آخری دور میں تو یقیناً آخری عامل ہی سب سے زیادہ مؤثر اور فیصلہ کن تھا۔

البتہ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ آزادی کے بعد بھی پاکستان اور بھارت کے مابین مسلسل دشمنی کی فضا اور ایک ایسی سرد جنگ کی کیفیت کیوں جاری رہی جس نے متعدد بار تو بالفعل آگ اور خون کی گرم بازاری کی صورت اختیار کی' اور ان کے علاوہ بہت سے مواقع ایسے بھی آئے کہ دونوں ملک سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ان الفاظ کے مطابق کہ: ﴿وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ یعنی ''تم تو آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے تھے!'' باضابطہ جنگ کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے' یہ دوسری بات ہے کہ رحمتِ خداوندی نے اسی آیت کے اگلے الفاظ کہ: ﴿فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا﴾ یعنی ''تو اللہ نے تمہیں اس سے نجات دی!'' کی سی شان کے ساتھ بچا لیا' چنانچہ آج کل پھر اس سرد جنگ کے گرم بھٹی کی صورت اختیار کرنے کا امکان بہت قریب آ گیا ہے' اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے حالات کے پیشِ نظر پاکستان کے بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی رہنماؤں سمیت بعض صحافی اور دانشور بھی بار بار افواجِ پاکستان کو للکار رہے ہیں کہ ''وہ اپنا فرض ادا کریں!'' تو اس سوال کا جواب اگرچہ بالکل نوشتۂ

دیوار کے مانند واضح ہے' تاہم سرحد کے دونوں جانب طالع آزما سیاست دانوں نے عوام کی جس نفسیاتی کیفیت کو پختہ کر دیا ہے اس کے باعث سب نے اس کی جانب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب جبکہ دونوں قوموں کی وہ نسل جو حصولِ آزادی کے بعد پیدا ہوئی' انسان کے ذہنی ونفسیاتی بلوغ کے سخت ترین قرآنی معیار یعنی چالیس سال کی عمر سے بھی آگے نکل چکی ہے (سورۃ الاحقاف: آیت ۱۵) دونوں جانب کے اصحابِ علم وفہم اور اربابِ دانش وبینش اس امر پر سنجیدگی سے غور کریں کہ پاک بھارت تعلقات کے ''بہتے دریا'' میں دونوں ملکوں کے عوام کے نصیب کی ''سیاہی'' ہی نہیں ان کے خون کی سرخی بھی کون گھول رہا ہے؟ اور آیا اس کے ازالے کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں؟۔

بھارت کے عوام اور ہمارے مابین تو یقیناً گوناگوں نوعیت کے نفسیاتی حجابات پر مستزاد بہت سی مادی فصیلیں بھی حائل ہیں' جن کی بنا پر ہماری بات کا ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے' لہٰذا کیوں نہ اس سنجیدہ سوچ بچار کا آغاز ہم پاکستانی مسلمان کریں؟ اس لئے کہ ہمارے لئے تو یہ مسئلہ اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے دونوں سب سے بڑے علمبرداروں' یعنی مصور ومفکرِ پاکستان علامہ اقبال اور معمار ومؤسس پاکستان قائداعظم محمد علی جناح' نے تقسیم کے بعد کے حالات کے ضمن میں جو خواب دیکھے تھے وہ اس صورت حال کے بالکل برعکس تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں قائداعظم نے تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کی تھی کہ ''بھارت اور پاکستان کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مابین ہیں''۔ لیکن علامہ اقبال نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) میں یہاں تک فرما دیا تھا کہ ''ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع مسلم ریاست ہر نوع کی جارحیت کے مقابلے میں ہندوستان کے دفاع کا فریضہ بہترین طور پر سرانجام دے گی' خواہ وہ جارحیت نظریات کی ہو خواہ ہتھیاروں کی!'' چنانچہ غور طلب بات ہے کہ کیا ہمارے یہ دونوں مسلّمہ قائد' خاکم بدہن' بالکل بے بصیرت اور کودن تھے؟ کہ انہوں نے ہندو مسلم

مفاہمت اور پاک بھارت تعاون کی جس سحر کی نوید سنائی تھی وہ نہ صرف یہ کہ فیض کے ان اشعار کے مصداق ابھی تک طلوع نہیں ہوئی بلکہ مستقبل میں بھی دور دور تک اس کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے دوست کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں!

اس گھمبیر سوال کا صاف وصریح اور حتمی وقطعی جواب صرف یہ ہے کہ نہ ہمارے قائد بے بصیرت تھے' نہ موجودہ صورتِ حال تقسیم کے فارمولے کا منطقی نتیجہ ہے' بلکہ اس پوری صورت حال کا واحد سبب مسئلہ کشمیر ہے جو انگریزوں کی عیاری' بدنیتی' خیانت اور بے ایمانی کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انگریزوں کو مسلمانانِ کشمیر کی ''قومِ نجیب وچرب دست وتر دماغ'' کے ساتھ کیا ازلی بغض اور خدائی بیر تھا کہ لگ بھگ سو سال پہلے تو انہوں نے اس پوری قوم کو ع ''قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند'' کے مطابق چند لاکھوں ٹکوں کے عوض ہندو ڈوگروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ اور پھر عین تقسیم کے وقت اولاً ایک انگریز یعنی ریڈکلف نے اپنے بدنام زمانہ ''اوارڈ'' کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار کر دی جو نہ صرف یہ کہ تاریخی وجغرافیائی' اور مذہبی اور ثقافتی جملہ اعتبارات سے پاکستان کا جزوِ لاینفک اور خاص طور پر آبی وسائل کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے' اور جو اس بنیادی اصول کے مطابق جو تقسیمِ ہند کے لئے طے ہوا تھا' یعنی یہ کہ مسلم اکثریت والے تمام ''ملحق علاقے'' پاکستان میں شامل ہوں گے' قطعی طور پر پاکستان کا حصہ بنتی تھی اور بعد میں جب ریاست کے مسلمانوں نے بغاوت کی اور اس صریح بے انصافی اور بددیانتی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا' اور پاکستان کے عوام اور بالخصوص قبائلی پٹھانوں نے ان کی مدد کی اور اس مسئلے کے آخری حل کے لئے پاکستان کی فوج کی بس

ذرا سی امداد کی کسر رہ گئی تھی' تو ایک دوسرے انگریز یعنی افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے قائداعظم کی خواہش بلکہ حکم کے علی الرغم آڑے آ کر اس حق تلفی کے فوری ازالے کا راستہ مسدود کر دیا۔ چنانچہ معاملہ یو این او کے سپرد ہوا اور پینتالیس برس سے اس کی فائلوں میں دفن پڑا ہے۔

وہ دن اور آج کا دن بھارت اور پاکستان کی حکومتیں اور عوام اپنے سابقہ غیر ملکی حکمرانوں کے اس کردار کا مزہ چکھ رہے ہیں جو سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۰۴ اور ۲۰۵ کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۞ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۞﴾

''بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ حیات و معاملاتِ دنیوی میں ان کی (چکنی چپڑی) باتیں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیتوں پر خدا کو گواہ بھی بناتے رہتے ہیں' حالانکہ وہ بدترین دشمن ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ پیٹھ پھیرتے ہیں (ذرا نوٹ فرمائیں یہ الفاظِ مبارکہ انگریزوں کی ہندوستان سے واپسی پر کس قدر عمدگی کے ساتھ چسپاں ہو رہے ہیں) تو زمین میں فساد برپا کرنے کی سعی کرتے ہیں تاکہ (اس کے ذریعے) زمین کی کھیتی اور انسانوں کی نسل کو ہلاک کر دیں!''۔

چنانچہ اس عرصے کے دوران بھارت اور پاکستان کے مابین کئی خونریز جنگیں بھی ہو چکی ہیں جن میں ہزاروں انسان ہلاک اور معذور ہوئے' لاتعداد عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے اور ارب ہا ارب روپے کے مالی نقصان دونوں ملکوں کو ہوئے۔ مزید برآں عوام کے خون پسینے کی کمائی کا بڑا حصہ بجائے عوامی بہبود اور تعلیم و ترقی کے مسلسل بڑی بڑی فوجوں کو ''کھڑی'' رکھنے اور مہلک اسلحہ کی خرید میں صرف ہوتا رہا۔ پھر ان کی باہمی چپقلش سے وقت کی دونوں سپر پاورز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اگر پاکستان نے اپنے ''بچاؤ'' کے لئے امریکہ کی ''پناہ'' حاصل کی تو بھارت نے روس کا دامن تھاما' اور

اس طرح دونوں ملک ان کی سرد جنگ میں ملوث ہو گئے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ سرد جنگ کے اصل فریقوں یعنی روس اور امریکہ کے مابین تو یہ جنگ ہمیشہ ''سرد'' ہی رہی جبکہ بھارت اور پاکستان کے مابین اس کی بھٹی بار بار دہکتی رہی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' کا مظہرِ اتم یہ ہے کہ اس پورے عرصے کے دوران بھی انگریز دونوں ملکوں کے نہ صرف مشترک دوست بلکہ مربی و سرپرست اور ناصح و ثالث بالخیر بنے رہے اور آج بھی میر تقی میر کے اس بدنامِ زمانہ شعر کے مصداق کہ ؎

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے ''لڑکے'' سے دوا لیتے ہیں!

کشمیر کے مسئلے کے حل کے لئے ہمارے یہاں اکثر و بیشتر دہائی دی جاتی ہے انگریز کے سرپرست امریکہ کی، اور حوالہ دیا جاتا ہے اس کے خانہ ساز ادارے یو این او کی قراردادوں کا۔

بہرحال اس ذہنیت اور طرزِ فکر پر تو ''بایں عقل و دانش بباید گریست!'' کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، لیکن اصل ضرورت اس کی ہے کہ ہم سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کریں کہ آیا ہمیں واقعات و حوادث کے اس دریا میں جس کا رخ ہماری سادہ لوحی پر مبنی خوش اعتقادی اور حسن ظن اور اغیار کی دشمنی اور عیاری کے باعث ایک خاص سمت میں موڑ دیا گیا تھا چار و ناچار بہتے ہی چلے جانا ہے، خواہ اس کے نتائج کتنے ہی مضر اور ہولناک ہوں، یا ہمت سے کام لے کر اس کے رخ کو بدلنے کی کوشش کرنی ہے!

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

(۴)

پاک بھارت مفاہمت
اور
مسئلۂ کشمیر کا حل

ہندو مسلم منافرت اور پاک بھارت مخاصمت کے قدیم اور تاریخی اسباب کو بالکل ختم کر دینا تو ظاہر ہے کہ اب ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''گیا وقت'' تو منفی اور مثبت دونوں کہاوتوں کے اعتبار سے ہماری دسترس سے باہر ہے۔ یعنی ع ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!'' اور ''میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں!'' لہٰذا پاک بھارت مفاہمت کی کسی بھی کوشش میں ہر اعتبار سے اوّلیت اور اہمیت موجودہ مسائل ہی کو دینی ہوگی جن میں سرفہرست مسئلۂ کشمیر ہے۔

تاہم اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ماضی سے متعلق بعض مزعومہ مسلّمات پر بھی کسی قدر تنقیدی نگاہ ڈال لی جائے کہ ان میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ آمیزی کتنی۔ اس لئے کہ اس سے مفاہمت کے لئے ذہنی تیاری میں مدد مل سکتی ہے۔

برہمن اور بنئے کے بارے میں ہمارے یہاں جو تصورات پتھر کی لکیر کی مانند پختہ ہو گئے ہیں انہیں ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو'' کے مصداق اگر کسی درجہ میں تسلیم کر بھی لیا جائے یعنی یہ کہ برہمن کا عمومی مزاج سامراجی ہے اور وہ یہودیوں کی مانند اپنے آپ کو ایک بالاتر اور برتر مخلوق گردانتا ہے اور بنئے کی ذہنیت بھی بالعموم یہودیوں ہی کی ایک دوسری صفت یعنی سودخوری اور اس سے پیدا شدہ چاپلوسانہ عیاری کے کردار کا

عکس ہے جس کی بہترین تعبیر ''منہ میں رام رام بغل میں چھری'' کے الفاظ سے ہوتی ہے' تب بھی ایک جانب تو یہ اٹل اصول ناقابلِ تردید ہے کہ ۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

گویا نہ سب برہمن ایک ہی مزاج کے حامل ہیں نہ تمام بنئے ایک ہی سی سرشت رکھتے ہیں۔ (خاص طور پر ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کی صورت میں جو ''برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز'' عطا فرمایا اس کی مثال بہت ہی نمایاں ہے!) اور دوسری جانب ہندو معاشرے میں کھشتری اور راجپوت بھی تو ہیں جن کی غیرت و حمیت' شرافت و مروت اور وسیع القلبی اور فراخ حوصلگی ضرب المثل ہے اور پھر سب سے بڑھ کر وہ پسماندہ قومیں بھی تو ہیں جو خود اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی ستم رسیدہ ہیں اور اگرچہ ماضی میں تو وہ ''بابندگی خوگرفتہ'' اور ع ''ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے!'' کی مصداقِ کامل بنی ہوئی تھیں لیکن اب ہندوستانی معاشرے میں پوری قوت کے ساتھ ابھر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ شمالی ہند کی یوپی اور بہار جیسی کٹر ہندو ریاستوں میں ان ہی میں سے بعض یعنی ''یادیو'' وزارتِ علیا پر بھی فائز ہو گئے۔ پھر تعداد میں بھی وہ بقیہ تینوں طبقات سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں!

اس ضمن میں لکھنؤ (یوپی' بھارت) سے شائع ہونے والے قدیم اور مؤقر دینی و علمی ماہنامے ''الفرقان'' کی ایک حالیہ اشاعت کے اداریہ کے حسب ذیل اقتباسات بہت اہم ہیں:

> ''ایک غلطی بہت مدت سے ہم ہندوستانی مسلمانوں سے ہو رہی ہے اور اس کے بہت سخت نقصانات ہم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں ــــــ وہ غلطی یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں بسنے والے اکثریتی فرقہ کو ایک ''قوم'' سمجھتے ہیں' حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے ــــــ اس غلطی کا سب سے بڑا نقصان یہ رہا ہے کہ اسی کی وجہ سے ہم اس مرعوبیت اور احساسِ کمتری سے نکل نہیں پا رہے ہیں' جو ایمانی کمزوری کے علاوہ اپنی اور اس ''قوم'' کی تعداد اور سیاسی اور معاشی پوزیشن

کے مابین زبردست فرق کو دیکھ کر ہمارے اوپر چھایا ہوا ہے ـــــ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی سماج وحدت کی کوئی بنیاد نہیں رکھتا ـــــ اس کو ایک متحدہ مذہبی تشخص عطا کرنے اور ان سب کو ایک گروہ بنا دینے اور اسے اکثریت کی خلعتِ فاخرہ پہنا دینے کی سازش اصل میں انگریزوں اور برہمنوں کے اشتراکِ عمل کے نتیجے میں' اور ہماری سادہ لوحی اور یہاں کے سماجی و مذہبی نظام سے براہِ راست ناواقفیت کی وجہ سے کامیاب ہوئی ہے۔ لیکن اب صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ اس ملک کے مظلوم طبقات ذلت و غلامی کے طوق سے اپنی گردن آزاد کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ کو بدلنے اور برہمنی جبر و استبداد سے نکلنے کی آواز پہلی بار لگی ہے' پہلے بھی یہ کوشش ہوتی رہی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاملہ اب جہاں تک پہنچ گیا ہے وہاں تک کبھی نہیں پہنچا تھا اور شاید اب یہ بات آگے ہی بڑھتی جائے گی''۔

پھر ہمارے لئے تو سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ بھارت میں صرف ہندو ہی آباد نہیں ہیں' مسلمان بھی ہیں اور اگر بھارتی مسلمانوں کی عام رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ بھارت کو دنیا میں سب سے زیادہ آبادی والا مسلمان ملک قرار دیا جا سکتا ہے۔ (عام سرکاری اعداد و شمار کی رو سے بھی دنیا بھر میں صرف ایک انڈونیشیا ایسا ملک ہے جو بھارت سے زیادہ تعداد میں مسلمان آبادی کا دعویٰ کر سکتا ہے) اور انگریزوں کی آمد سے قبل مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کے دوران بعض حکمرانوں اور مقتدر اشخاص کی ذاتی حرص و آز یا بوالہوسی کی بنا پر ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کے انفرادی واقعات' اور ان کے ضمن میں بھی حقیقت اور افسانہ کے تناسب کی تحقیق سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ کبھی کسی بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فساد یا تصادم کی تاریخ موجود نہیں ہے بلکہ صورت حال وہ رہی ہے جس کا نقشہ اسی ''برہمن زادہ'' نے ان الفاظ میں کھینچا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ۔

اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے' دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے' یا قربانی یا جھٹکا ہے

تو کیا یہ مسئلہ واقعتاً غور طلب نہیں ہے کہ۔ ''کون'' معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟ اس مقام پر اس بات کا حوالہ بھی یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا کہ بھارت کے ایک ہریجن لیڈر پالانی بابا نے اپنے ایک کتابچے میں جو ۱۴۔عزیز' ملک اسٹریٹ نمبر ۵ مدراس' تامل ناڈو سے شائع ہوا ہے' ہندوؤں کے سرکردہ رہنما پوری شنکر آچاریہ کے اس قول کے حوالے سے کہ ''اچھوت ہندو نہیں ہیں!'' یہ دعویٰ کیا ہے کہ بھارت میں ''ہندو'' اکثریت میں نہیں بلکہ اقلیت میں ہیں' اس لئے کہ بقول ان کے ''بھارت کی کل آبادی کے ۲۵ فیصد اچھوت ہیں' ۲۰ فیصد مسلمان ہیں' ۳ فیصد عیسائی ہیں' ۲ فیصد سکھ ہیں اعشاریہ سات فیصد بدھ مت کے پیروکار ہیں اور اس طرح بھارت کی غیر ہندو آبادی کل آبادی کا لگ بھگ ۵۱ فیصد بن جاتی ہے''۔

مزید برآں' اس ضمن میں بھی بعض حقائق ایسے بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی تاریخ کے حوالے سے ان دونوں قوموں کے مابین تلخی کا زہر گھولنے کا سب سے مؤثر کام بھی بعض انگریز محققین اور مؤرخین ہی نے سرانجام دیا۔ جس کی سب سے نمایاں مثال ایودھیا کی بابری مسجد کا معاملہ ہے' اس لئے کہ اس کے بارے میں یہ تحقیق کہ یہ مسجد رام جنم استھان پر بنی ہوئی ہے ایک انگریز ہی کی جانب منسوب ہے۔ اور پھر ایک دوسرے انگریز یعنی سول جج نے بجائے مسئلے کو حل کرنے کے مسجد پر تالا ڈال کر اور مقدمے کو طول دے کر پورے معاملے کو ایک ٹائم بم بنا کر رکھ دیا جو لگ بھگ سو برس بعد شدید ترین دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اور ہندو مسلم کشیدگی میں ایک نئے باب کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

بہرحال ان جملہ حقائق کے علی الرغم یہ بات اپنی جگہ بالکل کوہِ ہمالیہ کے مانند اٹل ہے کہ مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کے بغیر پاک بھارت تعلقات میں مستقل اور پائیدار بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اصل غور طلب بات یہ ہے کہ خود مسئلہ کشمیر

کے حل کے لئے ہمارے پاس کون کون سے آپشن موجود ہیں' اور وہ کس کس حد تک قابلِ عمل بھی ہیں اور متوقع طور پر نتیجہ خیز بھی؟

سب سے پہلے جنگ کو لیجئے جس کی آج کل بار بار دہائی دی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ فی الواقع اور خصوصاً بحالاتِ موجودہ کوئی قابلِ عمل حل ہے؟ کیا ہم جنگی صلاحیت کے اعتبار سے بھارت کے مقابلے میں آج کی نسبت ۱۹۶۵ء میں کہیں زیادہ بہتر حالت میں نہیں تھے؟ پھر اگر اس وقت کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی تو آج اس کی کتنی اُمید کی جا سکتی ہے؟

مسلمانانِ کشمیر پر بھارت کی ننگی جارحیت اور بے پناہ ظلم و بربریت کے خلاف پاکستان کی جانب سے کھلم کھلا اعلانِ جنگ صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ ہمیں اپنے موقف کے مبنی برحق و انصاف ہونے کے ساتھ ساتھ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۰ کے ان الفاظِ مبارکہ کے مطابق کہ: ﴿اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ﴾ یعنی ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا!'' اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا یقین بھی حاصل ہوتا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سودی معیشت کے نظام کو جاری رکھنے کے باعث خود ہی اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں' لہٰذا فرمانِ نبویؐ: ((فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ؟)) یعنی ''ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟'' کے مطابق ہمیں اللہ کی نصرت و تائید کی امید کیسے ہو سکتی ہے! بنا بریں لے دے کر سارا معاملہ صرف مادی اسباب و وسائل کی کمیت اور کیفیت کا رہ جاتا ہے' جس کا تقابلی جائزہ اور موازنہ آئے دن اخبارات کی زینت بنتا رہتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اس مستقل سنت کا مظہر ہے کہ: ﴿کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ﴾ (بنی اسرائیل: ۲۰) یعنی ''ہم یہ اور وہ (یعنی طالبانِ دنیا اور طالبانِ آخرت) سب کی آپ کے رب کے فضل و عطا سے مدد کرتے رہتے ہیں!'' کہ اس نے ہمیں اوّلاً ۱۹۷۱ء میں سابق صدر امریکہ' آنجہانی رچرڈ نکسن کے دل میں وہ بات ڈال کر جسے اس وقت اندرا گاندھی نے ''پروپاکستان بِلٹ'' سے

تعبیر کیا تھا' اس سے روسی وزیراعظم کوسی جن کو ہاٹ لائن پر الٹی میٹم دلوایا جس کے حکم کے تحت اندرا گاندھی نے ''یک طرفہ جنگ بندی'' کا اعلان کیا' جس کے نتیجے میں ہمیں بارگاہِ خداوندی سے ﴿مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۞﴾ یعنی مزید مہلتِ عمل مل گئی۔ پھر یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کا مظہر ہے کہ بعد میں اس نے ہمیں اپنے خصوصی فضل وکرم سے خالص معجزانہ طور پر ایٹمی صلاحیت کے ذریعے ایک مؤثر ڈیٹرنٹ عطا فرما دیا اور یہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی حکمت ومشیت میں ابھی ہمارے ﴿فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۞﴾ (''پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو!'' الاعراف:۱۲۹) والے امتحان کی مہلت اور مدت ختم نہیں ہوئی ہے۔ جس پر ہمیں سورۃ الانفطار کے ان الفاظِ مبارکہ کے مطابق کہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ۞﴾ یعنی ''اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے مہربان رب (کی جانب سے مہلت کی طوالت کے باعث اس کے مکافاتِ عمل کے قانون) کے بارے میں دھوکہ میں مبتلا کر دیا؟'' کے مصداق ہرگز دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ اس لئے کہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۴ اور سورۂ یونس کی آیت ۴۹ میں وارد شدہ الفاظ کے مطابق یہ مہلت کسی بھی لمحہ ختم ہو سکتی ہے۔ اور پھر جب یہ اچانک ختم ہو جائے گی تو اس میں مزید توسیع وتاخیر کسی طرح ممکن نہ ہوگی' بھوائے: ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۞﴾ (الاعراف:۳۴) یعنی ''پھر جب ان کی وہ معینہ گھڑی آ جائے گی تو نہ یہ لوگ ایک ساعت آگے بڑھ سکیں گے نہ پیچھے ہی کھسک سکیں گے!''

مزید برآں سب جانتے ہیں کہ یہ ایٹمی صلاحیت بھی صرف ''ڈٹرنٹ'' ہی ہے یعنی صرف بھارتی جارحیت کے خلاف ڈھال کا کام دے سکتی ہے۔ اسے خود بھارت پر حملہ کرنے کے لئے استعمال کرنے کا خیال جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ گویا نتیجے کے اعتبار سے یہ بھی جنگ کے ''آپشن'' کی نفی کے مترادف ہے!

رہا مسلمانانِ کشمیر کا سرفروشانہ اور بے مثال جہادِ حریت تو اس کے ضمن میں بھی جذبات سے ہٹ کر عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ کسی کھلم کھلا اور ٹھوس بیرونی

امداد کے بغیر آخر وہ اسے حکومت پاکستان کی صرف اخلاقی اور سفارتی مدد اور بعض نجی اداروں کی جانب سے چوری چھپے اور وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ کے بقدر امداد کے بل پر کب تک جاری رکھ سکیں گے؟

واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی بہت سے حلقوں' بالخصوص مذہبی گروہوں کی جانب سے عوام کو بہت بڑے بڑے مغالطے دیئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اولاً جہاد افغانستان کا حوالہ دیا جاتا ہے' حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس معاملے میں ایک سپر پاور کی کھلم کھلا' اعلانیہ اور فیصلہ کن مالی اور جنگی مدد حاصل تھی (جس کی بہتی گنگا میں خود پاکستان کے بہت سے مقتدر افراد اور مذہبی جماعتوں نے خوب خوب ہاتھ دھوئے!) لہٰذا کشمیر کے معاملے میں افغانستان کا حوالہ قیاس مع الفارق کی حیثیت رکھتا ہے۔ ثانیاً اس کے ضمن میں سورۂ نساء کی آیت ۷۵ کا حوالہ بھی بہت شدّ و مد کے ساتھ دیا جاتا ہے' یعنی

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝﴾

''(اے مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور و مجبور مردوں' عورتوں اور بچوں (کی مدد) کے لئے جنگ نہیں کرتے جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لئے خاص اپنے پاس سے حمایتی اور مددگار پیدا فرما!''

لیکن اس حقیقت کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس آیت کے مخاطب مدینہ منورہ کے وہ مسلمان تھے جنہوں نے خود اپنی ذات اور دائرۂ اختیار اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے پورے معاشرے میں اللہ کے دینِ حق کے عادلانہ نظام کو بالفعل قائم' اور اس کی شریعت کے احکام کو بہ تمام و کمال نافذ کر دیا تھا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ایک جانب تا حال ہم کتاب و سنت کی کامل بالادستی کا قولِ ثقیل زبانی کلامی طور پر بھی' اور اس دور میں ادا نہیں کر سکے جبکہ ہمارے ملک میں اس نام نہاد ''اسلامی جمہوری اتحاد'' کی حکومت قائم تھی جس میں ملک کی تقریباً قابلِ لحاظ مذہبی جماعتیں شامل تھیں

اور اس حکومت کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت بھی حاصل تھی جس کے ذریعے دستور میں بآسانی مطلوبہ ترمیم کی جا سکتی تھی۔ دوسری جانب خود ہمارے عوام کی عظیم اکثریت ایک طرف جاگیرداروں اور وڈیروں کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی ہے تو دوسری طرف سودی معیشت کی پیدا کردہ شدید مہنگائی' افراطِ زر اور بے کاری کی آگ میں جل رہی ہے' اور تیسری جانب سیاسی عدم استحکام نے ملک کی سلامتی اور سالمیت کو مخدوش' اور مہیب و ہولناک کرپشن اور کروڑوں اور اربوں کے غبن اور خرد برد نے ملک کو دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچا دیا ہے۔

ان حالات میں سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے ''جہادِ کشمیر'' کا غلغلہ بلند کرنے والوں کو یا تو عوامی چندوں میں سے اپنے کمیشن کے حصول کا لالچ ہو سکتا ہے' یا اولاً اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں شریعت کے بالفعل نفاذ اور پھر اپنے پورے ملک اور معاشرے میں اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لئے تن من دھن قربان کرنے کا کھکھیڑ مول لئے بغیر ع ''کتنا حسیں فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم!'' کے مصداق ''جہاد و قتال فی سبیل اللہ'' کے بلند و بالا مرتبہ و مقام پر فائز ہونے کا ''حسین فریب'' کھانے کا شوق ہو سکتا ہے..... ورنہ ع ''پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی!'' کے مصداق کہاں سورۂ نساء کی اس آیت مبارکہ کے مخاطب اصحابِ رسول (ﷺ و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور کہاں ہم پاکستانی مسلمان! ع ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!''

پاکستان اور بھارت کی کھلی جنگ یا مسلمانانِ کشمیر کے مسلح جہادِ حریت کے بعد مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے دوسرا آپشن یا متبادل راستہ یہ ہے کہ یو این او کے ذریعے اور اس کی پینتالیس سال پرانی قراردادوں کے مطابق کشمیر پر استصواب کرانے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے خود بھی ایک جانب براہِ راست دوبارہ یو این او کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے اور دوسری جانب اس کے ذیلی اداروں' جیسے حقوقِ انسانی کے کمیشن وغیرہ کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو ہموار کر کے بھارت پر دباؤ بڑھایا جائے۔

یہ راستہ نظری اعتبار سے تو سب سے سیدھا اور اس قضیئے کے حل کے لئے بظاہر بالکل ''صراطِ مستقیم'' اور ''سواء السبیل'' کے مصداق نظر آتا ہے' لیکن اب سے تین چار سال قبل تک تو اس کی راہ میں یو ایس ایس آر کا ویٹو بھی حائل تھا اور امریکہ کی عدم دلچسپی بھی سدِ راہ تھی' لیکن اب چونکہ ایک جانب خلیج کی جنگ اور یو ایس ایس آر کی تحلیل بلکہ تجہیز و تکفین کے بعد بظاہر ویٹو کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے اور دوسری جانب امریکہ نے گہری دلچسپی لینی شروع کر دی ہے' لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم ساری امیدیں اسی آپشن سے وابستہ کر دیں' لیکن نئی عالمی صورتِ حال میں یہ آپشن ہمارے لئے نہایت مہلک اور خطرناک بن گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ' جیسے کہ ع ''جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!'' کے مصداق عالمی حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے' اب امریکہ کو ''سول سپریم پاور آن ارتھ'' یعنی روئے ارضی کی واحد عظیم ترین قوت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور وہ اپنی اس حیثیت کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لئے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے قیام کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے' جس کے لئے یو این او اس کے خانہ ساز بلکہ ''خانہ زاد'' ادارے کی حیثیت سے آلۂ کار کا کام کر رہا ہے۔ اور چونکہ اب اس نیو ورلڈ آرڈر کے کلی تسلط کی راہ میں واحد عظیم طاقت جو کسی حد تک بالفعل سدِ راہ بنی ہوئی ہے وہ تو صرف چین ہے' البتہ ایک غیر اہم درجہ میں شمالی کوریا بھی ہے' اور سودے بازی اور بلیک میلنگ کی حد تک بھارت بھی' پھر عوامی جذبات کے اعتبار سے پاکستان بھی کسی حد تک سدِ راہ ہے' اور حکومت کی سطح پر فنڈامنٹلسٹ ہونے کے ناتے ایران بھی۔ مزید برآں مستقبل کے اندیشوں کے اعتبار سے افغانستان بھی امریکہ کے لئے ''توجہ طلب'' ہے تو روسی ترکستان کی حال ہی میں آزاد ہونے والی مسلم ریاستیں بھی' لہٰذا امریکہ کو اس پورے علاقے میں ''پولیس مین'' کا کردار ادا کرنے کے لئے ایک دوسرے ''اسرائیل'' کی شدید ضرورت ہے![1]

---

(۱) دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیں کہ یہ تحریر ۱۹۹۶ء کی ہے۔

اس تناظر میں اندھے کو بھی نظر آ سکتا ہے کہ ۔

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی!

کے مصداق چچا سام کی نظریں کشمیر پر مرکوز ہو گئی ہیں کہ اسے بھارت اور پاکستان دونوں سے ''واگزار'' کرا کے یا تو ایسی ''آزادی'' عطا کر دی جائے جو ۔

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!

کی مصداقِ کامل ہو۔ یا انتداب کے نام سے کشمیر کے ''میر'' یو این او کی ''زلفوں کا اسیر'' بنا دیا جائے۔ اور اس طرح مشرقی ایشیا کے عین قلب میں ایک دوسرا ''اسرائیل'' قائم کر دیا جائے' جہاں سے بیک وقت چین' بھارت' پاکستان' افغانستان' ایران اور ترکستان سب کو کنٹرول کیا جا سکے۔

کشمیر کے بارے میں امریکہ کے یہ عزائم اگرچہ چند ماہ قبل امریکہ کی نائب وزیر خارجہ برائے جنوبی ایشیا مسز رابن رافیل کے بیان دہی سے طشت از بام ہو گئے تھے تاہم اس سلسلے میں تفصیلی حقائق حال ہی میں بھارت کی دفاعی ریسرچ ٹیم کے سربراہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) افسر کریم کی مرتب کردہ رپورٹ کے ذریعے منظر عام پر آئے ہیں۔ جس کے مطابق امریکہ کے ''خود مختار کشمیر'' کے اس منصوبے میں مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے علاوہ لداخ کے کچھ علاقے بھی شامل ہیں اور یہ کہ ''اس سلسلے میں امریکہ نے بھارتی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے ایک خصوصی ٹیم جو ماہرین پر مشتمل ہے بھارت بھجوا دی ہے!'' چنانچہ فوری طور پر امریکہ کے ان ''ماہرین'' کا یہ کارنامہ بھی منصۂ شہود پر آ چکا ہے کہ ''آل پارٹیز حریت کانفرنس'' کے نام سے مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں اور گوریلا گروپوں کا جو مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آیا ہے اس کے دستور میں ''آزاد و خود مختار کشمیر'' کو بھی ایک متبادل آپشن کی حیثیت سے شامل کر لیا ہے! مزید برآں' ہوا کے نئے رخ کا اندازہ درگاہ حضرت بال سرینگر میں ۳۲ دن

محصور رہنے والے کشمیری لیڈر اور حریت پسند تنظیم ''آپریشن بالاکوٹ'' کے کمانڈر انچیف عمر خالد کے اس انٹرویو کے تیکھے انداز سے بھی بخوبی ہوسکتا ہے جو روز نامہ جنگ لاہور کی ۱۱ مئی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ ''کشمیری پاکستان سے مایوس ہو گئے ہیں اور مقبوضہ کشمیر میں خودمختاری کا نظریہ فروغ پانے لگا ہے'' اور ''پاکستان اقوامِ متحدہ کی قراردادوں پر عمل نہیں کرا سکتا تو اس سے الحاق کے لئے قربانیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے!'' وقس علیٰ ذلك! جس پر حزب المجاہدین کے سپریم کمانڈر غلام محمد صفی صاحب کو بھی کچھ بے بسی کے انداز سے کہنا پڑا کہ ''کشمیری مجاہدین کی تنظیموں میں بھارتی ایجنٹ داخل ہو گئے ہیں!'' بہرحال ع ''قیاس کُن ز گلستانِ من بہار مرا!'' کے مطابق اس سے حالات کی سنگینی کا پورا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس صورتِ حال میں عافیت اسی میں ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے اس دوسرے اور بظاہر سیدھے آپشن کا خیال قطعی طور پر ذہن سے نکال دیا جائے۔ ورنہ استصوابِ رائے کے لئے بھارت اور پاکستان دونوں کی افواج کے دونوں کشمیروں سے انخلاء کے بعد ظاہر ہے کہ کشمیر کا مستقبل کلی طور پر یو این او کے رحم و کرم پر ہوگا جس کے پردے میں امریکہ اس بندر کا روایتی کردار بآسانی کر سکے گا جس نے دو بلیوں کے مابین روٹی کی ''منصفانہ تقسیم'' کے بہانے پوری روٹی خود ہضم کر لی تھی جبکہ دونوں بلیاں منہ دیکھتی رہ گئی تھیں!

گویا مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ہمیں تھرڈ آپشن کو اختیار کرنا ہوگا جو بھارت یا پاکستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کے ساتھ ''آزاد و خودمختار کشمیر'' کا تھرڈ آپشن نہیں، بلکہ پاک بھارت جنگ یا یو این او کی ثالثی کی بجائے پاکستان اور بھارت براہ راست مذاکرات کے ذریعے مفاہمت کی کوشش کا تھرڈ آپشن ہو! جس کے لئے دونوں ملکوں کے اصحابِ دانش و بینش کی حد تک تو زمین بہت کچھ ہموار ہو چکی ہے، لیکن دونوں ملکوں میں قائم انگریز کا موروثی پارلیمانی نظام سب سے بڑی سدِ راہ ہے۔ اس لئے کہ حکومتیں اگر مفاہمت اور اصلاحِ حال پر آمادہ ہوتی ہیں تو دونوں ملکوں کی اپوزیشن

پارٹیاں سینتالیس سال کے دوران سرحد کے دونوں جانب کے عوام کی راسخ ہو جانے والی اجتماعی نفسیات کو مشتعل کر کے کسی اقدام کو ناممکن بنا دیتی ہیں ! جس کا سب سے نمایاں مظہر یہ ہے کہ متعدد دو طرفہ مسائل کے ضمن میں معاہدات کی جملہ تفاصیل طے ہو جانے اور ان پر جانبین کے پوری طرح متفق ہو جانے کے باوجود ان پر دستخطوں کی نوبت نہیں آ پاتی !

کاش کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے عوام و خواص سب کو اس صورتِ حال کا صحیح صحیح اندازہ ہو جائے اور یہ دونوں ملک سو سالہ ہندو مسلم منافرت اور سینتالیس سالہ پاک بھارت مخاصمت کی ''دیوارِ برلن'' میں کوئی فیصلہ کن شگاف ڈالنے کا انقلابی قدم اٹھا سکیں۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

NTN BEARINGS

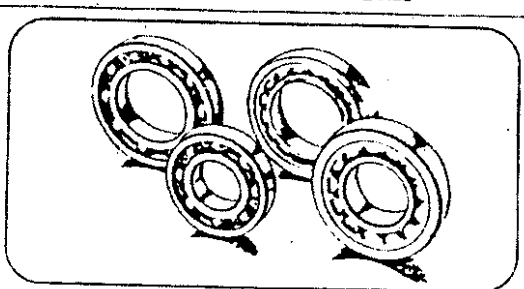

PLEASE CONTACT

Opp K M C Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan
G.P.O Box # 1178 **Phones** : 7732952 - 7730595 **Fax** : 7734776 - 7735883
E-mail : ktntn@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS ***SIND BEARING AGENCY***, 64 A-65 Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan) Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan Phones 7639618,7639718,7639818, Fax (42) 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

ضمیمہ

مسئلہ کشمیر.....ایک قابل عمل فارمولا

اقتباس از پریس کانفرنس ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۵ء

کشمیر کے خوفناک ترین مسئلے کے حل کے ضمن میں میری رائے یہ ہے کہ:

(i) اسے امریکہ یا UNO کے ذریعے حل کرانے کی کوشش ترک کر دی جائے اور چچا سام کو کم از کم اس مسئلے میں ''سلام'' کہہ دیا جائے اور یو این او سے بھی اپنا پاندان اٹھالے جانے کی درخواست کی جائے۔

(ii) اس کا حل شملہ معاہدے کے مطابق بھارت کے ساتھ براہ راست دوطرفہ گفتگو کے ذریعے جلد از جلد کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر کر لیا جائے۔ اور اس ضمن میں ایران اور چین کی خیر سگالی کو بروئے کار لایا جائے۔

(iii) اسے ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا قرار دیتے ہوئے اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح حل کیا جائے کہ:

ا) آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کو پاکستان میں ضم کر لیا جائے اور صوبوں کی حیثیت دے دی جائے۔

ب) اسی طرح جموں اور لداخ کے غیر مسلم اکثریت والے علاقوں کو بھارت اپنی ریاستیں بنا لے اور

ج) وادی کی حد تک بھارت اور پاکستان اپنے ہی اہتمام میں ریفرنڈم کرالیں اور صرف وادی کی حد تک بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے ساتھ ساتھ آزادی کا تھرڈ آپشن بھی دے دیا جائے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس کو داخلی خودمختاری تو پوری حاصل ہو لیکن خارجہ پالیسی اور دفاع کے معاملات پر بھارت اور پاکستان کی مشترکہ نگرانی ہو۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو عنقریب بھارت اور پاکستان دونوں روایتی بلیوں کے مانند دیکھتے رہ جائیں گے.....اور عظیم تر کشمیر کی پوری روٹی کو عالمی یہودی استعمار کا بندر ہڑپ کر جائے گا۔ اعاذنا اللہ من ذالک!

اقتباس از خطاب جمعہ مورخہ ۴ فروری ۲۰۰۰ء

حال ہی میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک تھنک ٹینک نے جس میں یہودیوں کی اکثریت شامل ہے' مسئلہ کشمیر کے حل کے ضمن میں ایک تجویز دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جموں اور لداخ کا علاقہ ہندوستان کو دے دیا جائے جبکہ آزاد کشمیر کو پاکستان کے پاس رہنے دیا جائے اور وادی کشمیر کو آزاد ریاست کا درجہ دے دیا جائے۔ ہمیں اس رائے سے محض اس لئے اختلاف نہیں کرنا چاہئے کہ یہ یہودیوں کے ذہن کی اختراع ہے۔ البتہ میری رائے میں اس تجویز کا آدھا حصہ قابل عمل ہے اور آدھا حصہ غلط ہے۔ اس فارمولے میں خامی یہ ہے کہ وادی کو اگر امریکہ یا یو این او کے رحم و کرم پر آزادی دے دی گئی تو اندیشہ ہے کہ ہارٹ آف ایشیا میں ایک نیا اسرائیل قائم ہو جائے گا۔

اگرچہ اس سے پہلے امریکہ کی سکیم یہ تھی کہ پاکستان' ہندوستان اور چین سے کشمیر کے سارے علاقے واپس لے کر یہاں ایک آزاد ریاست کی صورت میں امریکی اڈہ قائم کیا جائے' لیکن اللہ کا کرم ہوا اور بعض اطلاعات کے مطابق آئی ایس آئی نے امریکہ کی یہ سکیم ناکام بنا دی ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا درست حل یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کو تقسیم ہند کے نامکمل ایجنڈے کے طور پر حل کرتے ہوئے بھارت سے ملحقہ ہندو اکثریتی علاقوں یعنی جموں اور لداخ کو بھارت میں ضم کر دیا جائے اور اسی فارمولے کے تحت موجودہ آزاد کشمیر کو وادی سمیت پاکستان کا حصہ قرار دے دیا جائے۔ تاہم مناسب ہوگا کہ اس سارے عمل میں یو این او یا امریکہ کی ثالثی قبول نہ کی جائے بلکہ بھارت اور پاکستان دونوں باہمی مفاہمت سے یا پھر چین اور ایران کو ثالث مان کر اس مسئلے کو حل کریں تاکہ کوئی بیرونی طاقت اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر کشمیر میں قدم نہ جمانے پائے۔

دراصل بھارت کی کسی بھی حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کشمیر کے بارے میں اپنے عوام کے جذبات کے برعکس کوئی فیصلہ کر سکے لہٰذا یہ معاملہ تبھی حل ہو سکتا ہے جب بھارت اور پاکستان میں موجودہ تناؤ ختم ہو اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہو۔ ویسے بھی بھارت نے گزشتہ دس سال کے عرصہ میں پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کشمیر میں رکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے وسائل و ذرائع میں رہتے ہوئے اس مسئلے سے لمبے عرصے تک نبرد آزما رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جبکہ ہماری اقتصادی بدحالی کی ایک اہم وجہ مسئلہ کشمیر بھی ہے جس کے باعث ہم بھارت کے ساتھ کم و بیش ہر وقت ایک سرد جنگ کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ جتنی جلدی حل ہو سکے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس مسئلے کے حل کی ایک کم تر صورت یہ بھی ہو سکتی ہے جسے بھارتی عوام اور حکومت افہام و تفہیم کے بعد قبول کرنے پر تیار ہو سکتے ہیں۔ یعنی جموں اور لداخ بھارت میں ضم ہو جائیں اور موجودہ آزاد کشمیر مستقلاً پاکستان کا حصہ بن جائے اور صرف وادی کی حد تک استصواب کرا لیا جائے کہ وہ بھارت کے ساتھ ضم ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔ اور اگر وادی کے لوگ تھرڈ آپشن کے حق میں فیصلہ دیں تو صرف وادی کو اس شرط پر آزاد ریاست کا درجہ دے دیا جائے کہ اس علاقے کو کسی بیرونی طاقت کا اڈہ نہیں بننے دیا جائے گا۔

اقتباس از بیان پریس کانفرنس ۱۰ر جولائی ۲۰۰۱ء

میری عرصۂ دراز سے یہ پختہ رائے ہے کہ.....

(۱) کشمیر کے مسئلے کو تقسیم ہند کے متفق علیہ فارمولے کی روح کے مطابق اسی کے ایجنڈے کی ایک بقیہ شق کی حیثیت سے حل کیا جائے.....!

(۲) یعنی یہ کہ اصولی اعتبار سے تو مسلم اور غیر مسلم آبادی کی اکثریت کی بنیاد پر جس طرح نہ صرف یہ کہ پورا ہندوستان تقسیم ہوا بلکہ صوبے بھی تقسیم ہوئے یہاں تک کہ بعض اضلاع بھی تقسیم ہوئے اسی طرح کشمیر کے اس پورے مسلم اکثریت کے علاقے کو جو پاکستان کے ساتھ ملحق ہے' پاکستان کے حوالے کیا جائے اور غیر مسلم اکثریت کے ان علاقوں کو جو بھارت کے ساتھ ملحق ہوں' بھارت میں ضم کر دیا جائے۔ گویا صرف لداخ اور جموں کے وہ اضلاع جن میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو' بھارت میں مدغم ہو جائیں اور بقیہ پورا بھارتی کشمیر پاکستان کے حوالے کر دیا جائے.....

(۳) تاہم چونکہ بھارت کی رائے عامہ کے لئے اتنی بڑی قربانی کو ہضم (Reconcile) کرنا تقریباً ناممکن ہے لہٰذا قابل قبول اور قابل عمل حل یہ ہے کہ (i) آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان حسب سابق پاکستان کے پاس رہیں اور انہیں باضابطہ صوبوں کی حیثیت دے کر پاکستان میں شامل کر لیا جائے۔ (ii) اسی طرح لداخ اور جموں کے صرف بھارت سے ملحق غیر مسلم اکثریت کے علاقے بھارت میں ضم کر دیئے جائیں اور (iii) صرف وادی کشمیر اور اس سے ملحق لداخ اور جموں کے مسلم اکثریت کے اضلاع میں بھارت اور پاکستان اپنے مشترکہ اہتمام میں رائے شماری کرالیں اور اس میں یا بھارت یا پاکستان کے ساتھ ساتھ خودمختاری کا آپشن بھی شامل کر دیا جائے۔ اس لئے کہ چونکہ نصف صدی کے دوران وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے' اور نہ صرف بھارت کے مقبوضہ کشمیر میں بلکہ آزاد کشمیر میں بھی ایک مضبوط لابی بھارت اور پاکستان دونوں سے علیحدہ آزاد کشمیر کے قیام کے حق میں پیدا ہو چکی ہے جن کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ لیکن یہ آپشن اس شرط کے ساتھ مشروط ہونا چاہئے کہ داخلی طور پر کامل آزادی کے ساتھ ساتھ دفاع اور خارجہ اُمور کے ضمن میں وہاں بھارت اور پاکستان کا مشترکہ کنٹرول ہوگا تاکہ دنیا کی کوئی اور تیسری طاقت وہاں قدم نہ جما سکے!..... مزید برآں یہ کہ بھارت اور پاکستان دونوں ممالک کے شہریوں کو اس آزاد وادی میں آمدورفت کا بغیر ویزا حق حاصل ہو۔ اور وادی کے لوگ بھی دونوں ملکوں میں آزادانہ آمدورفت رکھ سکیں۔

میری تجویز کے اس آخری حصے کے ضمن میں بھارت کے سید شہاب الدین صاحب نے انڈورا کی مثال پیش کی ہے جو سپین اور فرانس کے درمیان سلسلہ کوہ پائرینیز کے دامن میں ایک چھوٹا سا ملک ہے جہاں صدہا برس سے فرانس اور سپین کے نمائندگان کی مشترکہ نگرانی میں آزاد حکومت قائم ہے۔

امیر تنظیم اسلامی کے نام بھارت کے معروف سیاسی رہنما
سید شہاب الدین کے تائیدی مراسلے کا عکس

Syed Shahabuddin
IFS (Retd.) Ex-MP

Advocate Supreme Court of India
Editor, Muslim India Monthly

Residence : Flat 404, Block-8
East End Apts. Mayur Vihar-I Ext.
Delhi-110096

Office : Behind 29, Feroze Shah Road
New Delhi-110001

Tel/Fax : 378 2069, Resi. : 271 1354

17 February, 2000

My dear Dr. Asrar Ahmad Saheb,

In the latest issue of your journal, I have seen the solution to the Kashmir problem suggested by you. I am glad that this comes very close to what I have been suggesting since beginning.

My approach is based on the fact that the State is multi-ethnic and historically an artificial construct. Northern Areas and the south western region below the Pir Panjal which are Punjabi-speaking should be incorporated in Pakistan. Ladakh and Jammu should be integrated in India. The Valley of Kashmir which is a geographical, linguistic and cultural entity should enjoy, like Andorra on the border of Spain and France, complete internal autonomy, **under the joint umbrella of India and Pakistan,** which should together underwrite its development and be responsible for its defence and foreign relations

Kashmiris should have access to both India and Pakistan for education, trade and even residence while neither Indians nor Pakisantanis have the right to settle in the Valley.

In my view, this is the only feasible solution which serves the interests of all partners – India, Pakistan and the Kashmiris.

With kind regards,

Yours sincerely,

(SYED SHAHABUDDIN)

جہاں نما

''اینڈورا''—— جس پر سپین اور فرانس کی مشترکہ حکمرانی ہے

اینڈورا (Andorra) یورپ میں ایک چھوٹا سا پہاڑی علاقہ ہے جس کے جنوب مغرب میں سپین اور شمال مشرق میں فرانس ہے۔ اس علاقہ پر ان دونوں ممالک کی مشترکہ حکمرانی ہے۔ صدر مقام انڈورا لاویلا (Andorra La Vella) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے Charlemagne نے ۸۰۳ء میں مسلمانوں سے آزاد کرایا اور اس کے بیٹے لوئس اول نے یہاں کے باشندوں کو پروانۂ آزادی دیا تھا۔ بعد میں فرانسیسی اور ہسپانوی شہزادوں کے مابین حق ملکیت کے تنازعہ پر تیرہویں صدی عیسوی سے یہ علاقہ دو مالکوں کا باج گزار چلا آ رہا تھا۔ یورپ میں جاگیردارانہ نظام حکومت کی یہ آخری نشانی ۱۹۹۳ء تک قائم رہی، جس کے بعد ایک آئین کے ذریعہ دہرے مالکان کے اختیارات بہت حد تک کم کر کے وہاں کے عوام پر مشتمل انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

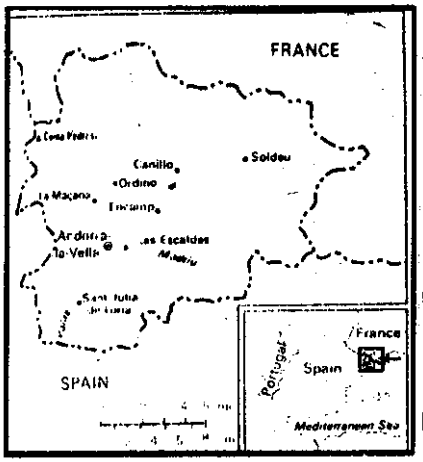

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے ماخوذ)

تزکیۂ نفس

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تزکیہ کے معنی ہیں صفائی، ستھرائی اور پاکیزگی۔ زکوٰۃ اس مال کو کہتے ہیں جس کی فی سبیل اللہ ادائیگی سے بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے، بلکہ بطورِ زکوٰۃ ادا کیا جانے والا مال بذاتہٖ بھی پاک اور طیب ہونا چاہئے، تب ہی وہ زکوٰۃ کے مفہوم میں آ سکتا ہے۔ اصطلاح میں باطنی بیماریوں یعنی اسقامِ قلوب کی صفائی کا نام تزکیہ ہے۔

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ صحت مند جسم اور پاکیزہ روح انسانیت کی زینت ہیں۔ انسانی جسم مٹی سے بنا ہے لہٰذا مٹی سے پیدا ہونے والی اشیاء یعنی مادی چیزیں اس کی غذا ہیں۔ آدمی زمینی پیداوار یعنی سبزیاں، پھل، اناج، دودھ اور گوشت جتنا زیادہ استعمال کرتا ہے اتنا ہی اس کا جسم بھرپور نشوونما پاتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ اس کے برعکس روح ایک لطیف چیز ہے۔ اس کی نشوونما کے لئے لطیف چیزیں نیکی، تقویٰ، عبادت، ذکر اور اطاعت ضروری ہیں۔ چونکہ جسم اور روح دونوں کی ماہیت ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لئے دونوں کے تقاضے بھی مختلف ہیں۔ جسم نشوونما کے لئے کثیف چیزوں کا تقاضا کرتا ہے جبکہ روحانی نشوونما کے لئے لطیف چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگر جسمانی نشوونما کے لئے غذا کم مقدار میں کھائی جائے تو اگرچہ جسم تو لحیم و شحیم نہ ہوگا لیکن روح کو بالیدگی میں سہولت ہوگی۔ بلکہ ایسے انسان کے لئے نیکی اختیار کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔ اسی لئے حدیث میں اس بات کی تلقین ہے کہ بھوک لگنے پر ہی کھانا کھایا جائے اور ابھی اشتہا باقی ہو تو دسترخوان سے ہاتھ کھینچ لیا جائے۔

جس طرح خوراک کی بے احتیاطی سے جسم مختلف النوع اسقام کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح خواہشاتِ نفس کی اتباع سے آدمی کو روحانی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔

جسمانی بیماریوں کی اذیت اور کرب کا احساس اِسی دنیا میں ہو جاتا ہے' کیونکہ جسم کا تعلق اس جہان سے ہے۔ چنانچہ بیمار تکلیف کے ازالے کے لئے فوراً ہی معالج کی طرف رجوع کر کے دوا حاصل کرتا ہے۔ لیکن روحانی بیماریوں کی شدت اور تکلیف کا احساس اس جہان میں نہیں ہوتا' کیونکہ روح اس جہان کی شے نہیں ہے۔ روحانی بیماریوں کا علاج اگر اس دنیا میں نہ کیا گیا تو آخرت میں ان بیماریوں کی اذیت اور تکلیف کا احساس طبعی ہوگا' لیکن اُس وقت اصلاحِ احوال کی مہلت ختم ہو چکی ہوگی اور روحانی امراض کا علاج ممکن نہ ہوگا' بلکہ روحانی اذیت انسان کو ہر طرف سے گھیر لے گی۔ اسی کیفیت کا نام عذاب ہے۔

انسان کو چاہئے کہ جس طرح وہ اپنی جسمانی بیماریوں کی اذیت کا احساس کرتا ہے اور پھر علاج معالجے میں سعی کرتا ہے اسی طرح روحانی بیماریوں کی طرف سے بھی غافل نہ رہے' بلکہ ہمہ وقت اپنے باطن میں جھانکتا رہے اور اپنی روحانی بیماریوں کو معلوم کر کے ان کے علاج کے لئے روحانی معالجوں کی طرف رجوع کرے۔

حدیث میں ''حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا''(۱) کے الفاظ اسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ وہ افراد جنہوں نے اپنے باطن میں روحانی فساد برپا نہیں ہونے دیا اور اپنے نفس میں نورانیت پیدا کر لی ہے وہی لوگ روحانی امراض کے معالج ہیں۔ اور سمجھ دار افراد روحانی اصلاح کے لئے انہی روشن ضمیر لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چونکہ یہ معالج روحانی صحت سے مالا مال ہوتے ہیں اس لئے یہ علاج معالجے کے بدلے میں مال و دولت کا تقاضا نہیں کرتے۔ چونکہ روحانی طور پر صحت مند ترین افراد انبیائے کرام ہیں اس لئے انہوں نے کبھی لوگوں سے معاوضہ طلب نہیں کیا' بلکہ ہر ایک نے یہی فرمایا: ﴿مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾ ''میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں طلب کر رہا''۔

تزکیۂ نفس کے لئے مؤمن ہونا شرط ہے' کافر کا تزکیہ ناممکن ہے۔ جو مسلمان حیاتِ دُنیوی میں تزکیۂ نفس سے غافل رہتا ہے اس کی کیفیت بھی عجیب ہوتی ہے۔ ایمان'

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفة القيامة و الرقائق و الورع' بروایت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

عمل صالح کا تقاضا کرتا ہے جس سے نفس میں پاکیزگی آتی ہے اور یہ نفسانی پاکیزگی اس کے ایمان کو مفید تر بناتی ہے' لیکن جب مؤمن خواہشاتِ نفسانی میں منہمک ہو کر حیاتِ دُنیوی میں باطنی صفائی کا اہتمام نہیں کرتا تو ایمان کے تقاضے کے طور پر اس کا تزکیۂ نفس تو ہو کر ہی رہتا ہے لیکن اس سے پہلے حیاتِ مستعار کے خاتمے پر ایسے مؤمن کو عذابِ الٰہی یعنی روحانی بیماریوں کے احساس میں ضرور مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہ کیفیت ایک مدت کے لئے اُس پر طاری رہے گی اور بالآخر وہ مؤمن ہونے کی وجہ سے عذابِ آخرت کے روپ میں تزکیۂ نفس کے مراحل طے کر کے جنت میں داخل ہو جائے گا۔

بدعمل مؤمن کو یہ غرّہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا ایمان بہت کافی ہے اور اسے نجات مل جائے گی' کیونکہ ایسے مؤمن کو بدعملی کی سزا عذاب کی صورت میں ملے گی اور عذاب خالق کائنات کے غضب کا نام ہے جس کی اذیت ایک لمحہ کے لئے بھی قابل برداشت نہیں۔ اس لئے ہر مؤمن کے لئے لازم ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے اور رضائے الٰہی کا سزاوار ہو۔ اس طرح اس کی کوتاہیاں اور تقصیریں بخش دی جائیں گی اور وہ آخرت میں فوز و فلاح سے ہمکنار ہو جائے گا۔ آنحضرت ﷺ کا اپنی بیٹی اور پھوپھی کو اعمالِ صالحہ کی پرزور تلقین کرنا اور یہ کہنا کہ نیک عمل کرو' ورنہ میں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا' اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

نفسانی بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں قرآن پاک جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن اپنے الفاظ میں ﴿مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت اور دل کی بیماریوں کی شفاء) ہے۔ اسی حقیقت کی توضیح کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ)) (۱)

''میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' اگر تم نے انہیں لازم پکڑا تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے: ایک قرآن اور دوسری میری سنت''۔

(۱) موطأ امام مالك' كتاب الجامع' باب النهى عن القول بالقدر

آنحضرت ﷺ کی سنت بھی دراصل قرآن ہی ہے' کیونکہ آپؐ کی سیرت سراسر قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ اسی لئے ہر شخص پر لازم ہے کہ سنت کی پیروی کرے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لئے اللہ کے رسول (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔

شیطان نے ہر مقام پر انسان کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کریم کو لوگ جسمانی بیماریوں کے لئے علاج تصور کرنے لگے ہیں اور یہ علاج ایک نفع بخش کاروبار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جسے حرص و ہوا کے بندوں نے دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے' حالانکہ قرآن تو باطنی بیماریوں کا علاج ہے۔

صحابہ کرام ؓ جو سیرتِ رسول ﷺ کی عملی تفسیر تھے' نہ راہب تھے نہ تارک الدنیا۔ وہ دنیا کی ہنگامہ خیزی میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ان کے نزدیک ذکر اللہ کی صرف یہی صورت نہ تھی کہ مسجد کے کونے میں ہمہ وقتی ڈیرہ جما کر بیٹھ گئے اور تسبیح و تکبیر میں مشغول رہے۔ ذکر اللہ بہرحال تزکیۂ نفس کے لئے محمود و مطلوب ہے' لیکن جب تک قلبی کیفیت درست نہ ہو زبانی ذکر اللہ کچھ زیادہ مفید نہیں' کیونکہ ذکر اللہ' صلوٰۃ' صوم اور دوسری عبادتیں قلب مصفّٰی کے ساتھ ہی مقبول و محمود ہیں۔ اعلیٰ قسم کے روح افزا مشروب کے لئے ضروری ہے کہ صاف و شفاف گلاس میں ڈال کر پیش کیا جائے' تاکہ وصول کرنے والے کے لئے قابل قبول ہو' لیکن یہی مشروب اگر اپنی تازگی' فرحت اور خلوص کے باوجود گندے اور غلیظ گلاس میں پیش کیا جائے تو وصول کنندہ کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝﴾

(الشعراء:۸۸'۸۹)

''اس دن مال اور بیٹے نفع نہ دیں گے' البتہ جو کوئی سلامت دل کے ساتھ آیا''۔

یعنی دل کی سلامتی آخرت میں مفید رہے گی۔

تزکیۂ نفس کے اوّلین ماہرین انبیائے کرام علیہم السلام تھے۔ آنحضرت ﷺ کے فرائض منصبی میں لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی شامل تھا۔ گویا جو لوگ سیرتِ رسولؐ کی اتباع میں لگ گئے پس وہ مزکی ہو گئے اور فلاح پا گئے۔ انبیاء کے بعد تزکیۂ نفس کے معالجین وہ نیک نفس علمائے دین ہیں جنہوں نے قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی تعلیمات کو اپنا کر سنت رسول کو صحیح معنوں میں عملاً اپنی زندگی میں اختیار کر لیا۔ یہی نفوسِ قدسیہ انسانیت کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ روحانی اَسقام کے علاج کے لئے ان ہی مردانِ حق آگاہ کے پاس جانا چاہئے۔ انہی لوگوں کی تلقین اور نصیحت روحانی روگ مٹانے کے لئے سریع التاثیر ہوگی۔ اسی بات کو یوں واضح کیا گیا ہے۔

''یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا''

شیطان نے ایک اور چال چلی۔ وہ لوگوں کو تزکیۂ نفس کے لئے فوت شدہ بزرگوں کے مزاروں پر لے گیا اور ان کی قبور کی زیارت سے ان کے دل کو مطمئن کر دیا۔ اب لوگ خوشی خوشی اولیاء اللہ کے مزاروں پر جاتے ہیں' نیاز مندی کے ساتھ حاضری دیتے ہیں اور خوشی خوشی واپس آ جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صاحبِ قبر کی طرف سے کسی قسم کی تلقین و نصیحت محال ہونے کی وجہ سے خارج از بحث ہے' بس مطلق زیارت کافی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے زیارتِ قبور کی اجازت ہی نہیں بلکہ تلقین کی ہے' لیکن موت کی یاد کے لئے۔ اور یہ موت کی یاد بلاشبہ تزکیۂ قلوب کے لئے مؤثر ہے' مگر اَسقام قلوب کے لئے تو کسی زندہ صاحب نظر کے پاس ہی جانا ہوگا' جو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دے اور اتباعِ سنت کی تاکید کے ساتھ عملی نمونہ بھی پیش کرے۔

ہماری طاعات اور عبادات میں کیفیت نفس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قلبِ منور کے ساتھ عبادت کا وزن زیادہ ہو جاتا ہے' جبکہ اسی مقدار میں کی گئی عبادت تقریباً بے وزن ہو جاتی ہے اگر عبادت گزار کا دل تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن کے قلوب کا تزکیہ خود رسول پاک ﷺ کے ہاتھوں ہوا' ان کی عبادت کو

درجے اور مقام کے اعتبار سے کسی غیر صحابی کی عبادت نہیں پہنچ سکتی' کیونکہ غیر صحابی کا تزکیۂ نفس صحابیؓ کے تزکیۂ نفس کے برابر ہونا محال ہے۔ ایک صحابی کی ادنیٰ سی عبادت دیگر علمائے اُمت کی اعلیٰ درجے کی عبادت سے بہت بلند ہے' اگرچہ مقدار میں کم ہو۔

اصلاحِ قلب تمام عبادات کی قبولیت کے لئے شرط ہے۔ اسی نکتے کو رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے' اگر وہ درست ہے تو سارا جسم درست ہے اور اگر وہ خراب ہے تو سارا جسم خراب ہے' اور وہ ٹکڑا دل ہے (۱)۔ اس سے اصلاح قلب یعنی تزکیۂ نفس کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

قلب کی بیماریاں ہوائے نفس میں انہماک کی وجہ سے بالکل معمولی نظر آتی ہیں۔ لیکن متقی اور پرہیزگار انسان ان سے ہر آن خبردار رہتا ہے اور ان کے اثر بد سے غافل نہیں ہوتا۔ یہاں قلب کی چند بیماریوں کا تذکرہ بھی مفید طلب ہوگا۔ حلال و حرام میں تمیز نہ کرنا' جھوٹ' غیبت' بددیانتی' ملاوٹ' دھوکہ' فریب' چوری' بدعہدی' بے وفائی' ہمسائے کے ساتھ بدسلوکی' حسد' بغض' بدخواہی اور بداخلاقی وغیرہ روحانی بیماریاں ہیں۔ دل کا مریض ان گناہوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتا' حالانکہ قرآن و سنت میں ان کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً حرام خور کی عبادت قبول نہیں' حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو' بدعہدی نفاق کی علامت ہے۔ لیکن شیطان ایسا چال باز ہے کہ روزِ روشن کی طرح واضح حقائق کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے اور ظلمات میں گھرے ہوئے انسان کو سراسر نورانیت کا احساس دلاتا ہے۔

ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالناoo

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترک الشبہات

شرک کی برائیاں اور نقصان

قرآن وحدیث کی روشنی میں

مرتبہ: حافظ محمد سلیمان ایم ایڈ

۱) حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمان:۱۳)

''یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: بیٹا! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

۲) جس آیہ مبارکہ (الانعام:۸۲) میں ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے جو اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کرتے' وہاں ''ظلم'' سے مراد شرک ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالُوْا: اَيُّنَا لَمْ يَلْبِسْ اِيْمَانَهٗ بِظُلْمٍ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِنَّهٗ لَيْسَ بِذَاكَ' اَلَا تَسْمَعُ اِلٰى قَوْلِ لُقْمَانَ لِابْنِهٖ: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾)) (۱)

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ تو آنحضرت ﷺ کے اصحاب پر بہت گراں گزری' وہ کہنے لگے ہم میں کون ایسا ہے جس نے ایمان کے ساتھ ظلم

۱) صحیح البخاری' کتاب التفسیر' باب قوله ﴿لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾

(یعنی گناہ) نہ کیا ہو؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس سے یہ مراد نہیں ہے (یعنی اس آیت میں ظلم سے ہر گناہ مراد نہیں ہے' بلکہ شرک مراد ہے) کیا تم نے لقمان (علیہ السلام) کا قول نہیں سنا؟ جو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا: ﴿ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾

۳) شرک سب سے بڑا گناہ ہے' بالفاظ دیگر یہ اکبر الکبائر ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الذَّنْبِ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰہِ نِدًّا وَھُوَ خَلَقَکَ))[1]

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کون سا گناہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ تو اللہ کے شریک یا برابر والا کسی اور کو بنائے' حالانکہ تجھے اللہ نے پیدا کیا۔''

۴) شرک کے گناہ کی سنگینی کا اس بات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والدین کے حقوق کا انتہائی زوردار الفاظ میں ذکر کرنے کے بعد قرآن مجید میں دو جگہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ماں باپ بھی اپنی اولاد کو شرک کرنے پر مجبور کریں تو اولاد کے لئے واجب ہے کہ وہ اس ناجائز حکم کی تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دیں۔

﴿وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاھَدٰکَ لِتُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا ؕ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (العنکبوت:۸)

''ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے' لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔ میری طرف ہی تم سب کو پلٹ کر آنا ہے' پھر میں تم کو بتلاؤں گا کہ تم کیا کرتے ہو۔''

﴿وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ ۚ حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ وَّفِصٰلُہٗ فِیْ

---

۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون الشرک اقبح الذنوب

عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ۞ وَاِنْ جَاهَدٰکَ عَلٰی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞﴾ (لقمان: ١٤، ١٥)

''اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لئے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا' میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ' مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے۔ اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔''

۵) شرک بہت بڑا جھوٹ ہے' بڑے سخت گناہ کی بات ہے' گمراہی میں بہت دُور نکل جانا ہے۔ شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا ناپسندیدہ ہے کہ وہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا' اس کے علاوہ جتنے بھی گناہ ہیں وہ جسے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰی اِثْمًا عَظِیْمًا ۞﴾ (النساء: ٤٨)

''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا' اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ۞﴾ (النساء: ١١٦)

''اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے' اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے' جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔''

قسط وار سلسلہ (9)

جدید دنیا سے اسلام

الجزائر (Algeria)

(آخری قسط)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

فاتح قوم مفتوح قوم کی روح کو کچلنے کے لئے اس کی زبان کے تمام رشتے کاٹ دیتی ہے' جن میں ذریعہ تعلیم بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے بھی یہی کیا تھا کہ فارسی اور عربی کو برطرف کر کے اپنی انگریزی کو دفتری وسرکاری زبان قرار دے دیا اور ذریعہ تعلیم بھی بنا دیا۔ فرانس نے بھی الجزائر پر فوجی تسلط قائم کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے ان کی زبان اور ذریعہ تعلیم کو تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں کو مدرسے اور سکول قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نوآبادکار یورپی لوگ حکومت فرانس پر دباؤ ڈالتے رہے کہ الجزائریوں کو تعلیم کے شعبے میں آنے سے سختی سے روکا جائے۔ چنانچہ ایسے قوانین بنا دیئے گئے کہ سکول اور مدرسہ کھولنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یورپی طرز کے سکول جگہ جگہ سرکاری سرپرستی میں کھول دیئے گئے (جیسا کہ آج کل پاکستان میں ہو رہا ہے' مثلاً سینٹ انتھونی' سینٹ جونز' امریکن سٹائل کے سکول وغیرہ)۔ مسلمان اپنے بچوں کو بے دین' غیر مسلم سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے' کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مغربی تہذیب میں رچ بس کر اپنی اصلیت' اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے دور ہو جائیں گے۔

سرکاری سکولوں کا نصاب مکمل طور پر فرانسیسی تھا۔ کہا گیا کہ ان سکولوں کے ذریعے الجزائری بچوں کو فرانسیسی تہذیب سے آشنا کرایا جائے گا اور تہذیب سے ناآشنا جاہل الجزائریوں کو مہذب بنایا جائے گا۔ اس مشن کے تحت فرانسیسی زبان' ثقافت اور تہذیب کو متعارف و مستحکم کرنے کے لئے ایک طویل المیعاد منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ ان سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ مشاہیر فرانس کے تاریخی کارناموں اور واقعات سے بھرپور ہوتی' جس میں اسلام' مسلمان' کلمہ' مکہ' مدینہ' قرآن اور اسوۂ رسول ﷺ کا ذکر تک نہ ہوتا تھا۔ اس نظام تعلیم کے ذریعے ایک طرف تو مسلمان کو ختم کرنا مقصود تھا اور دوسری طرف ''عرب'' کو۔ سرکاری سکولوں میں داخلے کے لئے طالب علم اور اس کے خاندان کے بارے میں چھان بین کی جاتی اور مقامی آبادی میں سے ایسے چنیدہ گھرانوں ہی کے

نونہال داخل کیے جاتے تھے جو بڑے ہو کر فرانس کے خوشامدی ملازم کا کردار ادا کر سکیں۔

فرانسیسی نظامِ تعلیم نے الجزائر کی معاشرت اور سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تعلیم ہی کی مدد سے فرانس نے الجزائر اور دیگر مسلم نو آبادیوں میں انتظامی مشینری قائم کر لی تھی۔ دیہی سکولوں سے لے کر شہروں میں سینٹ لوئی کی سطح کے اونچے سکولوں تک فرانسیسی نصاب پڑھانے کے پابند تھے۔ عربی بولنا جرم اور فرانسیسی میں بات کرنا تہذیب یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ 1903ء سے پہلے سکولوں میں عیسائی پادریوں اور مبلغوں کو کام کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ 1903ء میں یہ کام خود حکومت نے سنبھال لیا۔ اب شہروں اور دیہات میں بے دین مغربی تہذیب پھیلانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جانے لگا۔ مسلمان ایک طرف اپنے دین کو مسخ ہونے سے بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور دوسری طرف عیسائیت کے جارحانہ حملوں کا تدارک بھی کرتے تھے۔ فرانس چاہتا تھا کہ وہ الجزائر پر اپنے فوجی تسلط کو رفتہ رفتہ سول انتظامیہ میں تبدیل کر دے۔ اور اس تبدیلی کا بہترین طریقہ فرانسیسی نظامِ تعلیم کا استحکام تھا۔

کرسچین مشن سکولوں کے اخراجات کم رکھنے کے لئے سرکاری امداد دی جاتی تھی اور مسلمانوں کو دینی مدارس کھولنے کی اجازت بڑی مشکل سے دی جاتی تھی۔ اجازت دینے کے بعد طرح طرح کی پابندیاں اور رکاوٹیں کھڑی کی جاتی تھیں، جن کے باعث مدرسہ قائم کرنے والے دو چار برس میں تھک ہار کر مدرسہ بند کر دینے پر مجبور ہو جاتے۔ 1903ء میں ایک حکم جاری کر دیا گیا کہ دینی مدارس کو محدود اور کنٹرول کیا جائے، جس مدرسے میں طلبہ کی تعداد 20 سے کم ہو گی اسے غیر قانونی تصور کیا جائے گا، جن اوقات میں فرانسیسی سکول کھلے ہوں ان اوقات میں مدرسوں میں تعلیم و تدریس نہیں ہو سکتی۔

عیسائی صاف کہتے تھے کہ خداوند نے الجزائر انہیں عطا کیا ہے، مسلمانوں کو عیسائی بنانا اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر سے بربریت نکل جائے، یہ ایک انسانی ضرورت ہے، یہی ایک پالیسی ہے جسے بروئے کار لائے بغیر فرانسیسی حکومت کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ سرکاری احکامات کے تحت الجزائر کی مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ گرجا گھروں کے لئے فرانس اور دوسرے یورپی ملکوں سے پادری کثیر تعداد میں الجزائر بھیجے گئے تھے۔

ایک فرانسیسی سرکاری رپورٹ کے مطابق الجزائر پر قبضے کے وقت مسلمانوں کے دینی مدرسوں کا ایک وسیع جال موجود تھا۔ ان مدرسوں میں عربی اور اسلامی علوم کی زبردست تدریس ہوتی تھی۔ تیونس میں بھی بالکل ایسی ہی صورت حال تھی، جہاں ان سکولوں کے ساتھ ساتھ مسجد سکول بھی قائم تھے۔ قاہرہ کے جامعہ ازہر کے معیار کا ایک بڑا مدرسہ جامعہ زیتونیہ بھی موجود تھا جو ایک مسجد میں قائم کیا گیا تھا۔ اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم کے دو سکول بھی قائم تھے جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین غیر ملکی زبانوں میں پڑھائے جاتے تھے اور اسلامی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

الجزائر پر قبضے کے بعد فرانس نے دوہرا نظامِ تعلیم رائج کیا۔ ایک قسم کے نظامِ تعلیم کے لئے کتابیں اور اساتذہ فرانس سے درآمد کئے گئے جبکہ دوسرا نظامِ تعلیم الجزائر کے مقامی مسلمانوں کے لئے تھا۔ یہاں ''فرنچ مسلمان'' پڑھتے تھے۔ ان کا نصاب بھی فرانس نے مرتب کیا تھا اور اس نصاب کے مطابق قاعدے اور کتابیں بھی فرانس سے چھپ کر آتی تھیں۔ (بالکل پاکستان والا معاملہ تھا!) فرانسیسی زبان ذریعۂ تعلیم تھی اور عربی ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے پڑھی جاسکتی تھی۔ دینی مدارس حکومت کی سخت پابندیوں کے باعث رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے۔ فرانسیسی قبضے کے پچاس سال بعد فرنچ مسلم سکولوں (اینگلو انڈین سکول یاد آنے چاہئیں!) میں الجزائری طلبہ کی تعداد بمشکل تین ہزار تھی' جبکہ فرانسیسی سکولوں میں طلبہ کی تعداد ستاون ہزار تھی' جن میں الجزائر کے طلبہ کی تعداد بمشکل پندرہ سو تھی۔ یہ تعداد پرائمری سکولوں میں تھی' جبکہ ہائی سکولوں میں دو ہزار طلبہ میں سے الجزائری طلبہ کی تعداد 226 تھی۔

یہ صورتِ حال دوسری جنگ عظیم کے کچھ عرصہ بعد تک قائم رہی۔ فرانس کو بہتری کا خیال اُس وقت آیا جب الجزائر کے عوام اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے اور الجزائری عوام کے انقلاب کا آغاز ہو رہا تھا۔ 1954ء میں حقیقی صورتِ حال یہ تھی کہ دس میں سے ایک الجزائری طالب علم کو ''فرنچ مسلم'' سکولوں میں داخلہ حاصل تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فرانس کی کوشش یہ رہی کہ الجزائریوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ الجزائر کے ساتھ جو سلوک ہوا وہی فرانس نے اپنی دوسری نوآبادیوں مثلاً تیونس اور مراکش میں بھی روا رکھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کو اپنی اپنی غلام نوآبادیوں میں بہتری کا خیال آیا۔ الجزائر میں تعلیمی اصلاحات کا اعلان کیا گیا' جن میں سے ایک اعلان سکولوں کو قومی تحویل میں لینے کا بھی تھا۔ لیکن اسے یہ کہہ کر مشروط کر دیا گیا کہ ذریعۂ تعلیم فرانسیسی زبان ہوگی۔ فرانسیسی زبان واحد ذریعۂ تعلیم تھی۔ تیونس میں آزادی سے صرف چھ سال قبل ریاضی کو عربی زبان میں پڑھانے کی اجازت دی گئی لیکن صرف پرائمری سطح تک۔

1930ء کے عشرے میں فرانسیسی حکومت کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ الجزائریوں کے قلب و ذہن سے اسلام کی روح کو نکال دینا آسان کام نہیں ہے' لیکن وہ اسلام کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھی۔ وہ اسلام کے بنیادی اور اصل ماخذ پر حملہ کرنے سے کتراتے تھے اور اسے ''قدامت پسند'' کہہ کر جان چھڑانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اب ایسے ہتھکنڈے اختیار کرنے شروع کر دیئے جن کے تحت لوگ اسلام سے بددل ہو جائیں' اور دوسری طرف خاص اہتمام کیا جائے کہ افریقہ کو اسلام سے پہلے کے دور میں لے جایا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ دور جاہلیت کا تھا جب افریقیوں کو تہذیب سے ذرا بھی آشنائی نہ تھی۔ الجزائر میں عیسائی مبلغین اور پادریوں کو حکومت فرانس کی جانب سے سرکاری امداد مل رہی تھی کہ وہ افریقہ کے جنگلوں اور صحراؤں میں تن تنہا نکل کر' عیسائیت کی رہبانیت کی طرز پر' قبل از

اسلام سے پہلے کی زندگی ہی کو نیکی اور تقویٰ قرار دیں۔ لیکن فرانس میں ایسے دانشور اور مفکر بھی موجود تھے جن کو یہ شعور حاصل ہو گیا تھا کہ مسلمان کی قوتِ ایمانی پر ایسے مصنوعی حربوں اور طریقوں سے ضرب لگانا ممکن نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا کہ فرانس اور اسلام کے درمیان مخاصمت کو کم کیا جائے اور مسلمانوں کو دوست بنا کر فرانسیسی بنایا جائے۔

دینی مدارس کا احیاء

1924ء کی تعلیمی اصلاحات کے تحت ''قرآن سکول'' قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ تمام گورنروں کو حکومتِ فرانس کا یہ حکم پہنچا دیا گیا کہ گورنر جنرل کی اجازت سے ایسے مدرسے قائم کئے جا سکتے ہیں جن کا بنیادی مقصد مسلمانوں اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ پیدا کرنا ہو۔ ایسے مدرسوں میں تعلیم پانے والے افراد مقامی آبادیوں کے لئے قائم ٹریبونلوں (پنچایتوں) کے منتظم اور منصف ہوں گے' یعنی وفادار بیوروکریٹ۔

الجزائر کے علمائے دین ان تمام حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اسلامی قوانین کا اطلاق ان کی منزلِ مقصود تھی۔ اسلامی نظامِ تعلیم کا قیام ان کا مشن تھا۔ ان کے خیال میں اسلامی نظامِ تعلیم چار بنیادی اہداف کے حصول کا نام تھا۔ پہلا دینی تعلیم' دوسرا اخلاقی تربیت' تیسرا ذہنی تربیت اور چوتھا مادی ضروریات کی تکمیل۔ ابن بادیس کی اصل جدوجہد اور تحریک کا مقصد ان اہداف کا حصول تھا۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے ایک ایک فرد کو اجتماعیت میں رنگنے کی کوشش کی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہر مسلمان انفرادی حیثیت میں آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر صدقِ دل سے عمل کرے اور اپنی کوشش کے اثرات و ثمرات سماج کی طرف منتقل کر دے۔ اسی لئے ان کے تعلیمی نظریات میں اس بات کو اوّلیت حاصل تھی کہ ہر مسلمان اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں ایک مکمل انسان ہو۔ وہ مکمل انسانی شخصیت پر یقین رکھتے تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ فرانسیسی استعمار و استبداد میں یہ کام انتہائی مشکل ہے۔ وہ مسلمان کو جسمانی اعتبار سے مضبوط' ذہنی طور پر بالغ نظر اور اخلاقی اعتبار سے مکمل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نظریات کے مطابق انسانی کمال یہ ہے کہ وہ علم کا پیاسا ہو' عزم کا پختہ ہو' قوت کا منبع ہو' کام کرنے میں آگے آگے ہو اور اس کا کردار نفاست اور پاکیزگی کا آئینہ دار ہو۔ انسانی زندگی پیدائش کے ساتھ ہی تعمیر ہونا شروع ہو جاتی ہے اور موت تک تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ ''عزم' علم اور کام'' یہ احمد بن بادیس کا سہ لفظی نعرہ تھا اور مشن بھی۔ یہ تین خوبیاں مزید تین باتوں پر انحصار کرتی ہیں۔ کام کا تعلق مضبوط جسم سے ہے' ثقہ علم اور پختہ عزم کو بلند کردار سے حوصلہ ملتا ہے' جس سے مفید کام جنم لیتا ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی کو ان تینوں خوبیوں کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ ایسے افراد تیار ہو جائیں تو تہذیبی احیاء کا کام مشکل نہیں رہتا۔ الجزائر کے علمائے دین کے سامنے ایسے افراد تیار کرنے کا نصب العین تھا' الجزائر کی نئی نسل کو نئے حوصلوں اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔

احمد بن بادیس نے اپنے ایک مضمون میں کہا تھا:

''ہم اپنے شاگردوں کو قرآن پڑھاتے ہیں اور انہیں نصیحت اور ہدایت کرتے ہیں کہ وہ قرآن کا مطالعہ پہلے دن سے' اور پھر ہر دن ایسے جذبے اور لگن سے کریں کہ اُن کے قلوب میں یہ امید روشن ہو جائے کہ قرآن سے ان کے اندر بھی وہی عظیم انقلاب جنم لے گا جو ہمارے آباء واجداد اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے برپا کیا تھا''۔

احمد بن بادیس کے نظریات نے علمائے دین میں ایسی انقلابی روح پھونکی کہ وہ اسلام کے نہ صرف تحفظ پر کمربستہ ہو گئے بلکہ اس کے مکمل احیاء وتجدید' معاشرتی زندگی میں اسلام کا نفاذ اور سیاست میں اسلام کے اصولوں کی بالادستی کے لئے ہر چیز قربان کرنے پر تیار تھے۔

اس تحریک کو فرانس کی سخت گیر پالیسی کا ردِ عمل بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ خود علمائے دین کی جدوجہد بھی تھی کہ اسلامی اقدار وتعلیمات کو اُن کی اصلی حالت میں پیش کیا جائے' تعلیم کو عام کیا جائے اور مسجد کو ایک بار پھر تعلیمی مرکز بنا کر کام کا آغاز ہو' تاکہ ایک طرف تو الجزائری مسلمانوں کے منتشر گروہوں کو متحد کیا جائے اور دوسری طرف انہیں فرانسیسی سامراج کے خلاف جنگِ آزادی کے لئے تیار کیا جائے۔ مسجد سے متعلقہ ہر فرد' خواہ وہ امام تھا یا خطیب' مؤذن تھا یا واعظ یا خادم' اس نے عام مسلمانوں کو تعلیم دینا اپنا فرض قرار دے لیا۔ سب سے پہلے ایمانیات' پھر عبادات اور پھر معاملات کے بارے میں عام اصولوں کی تعلیم وتلقین کی گئی۔

حکومت فرانس علمائے دین کی ان سرگرمیوں سے آگاہ تھی۔ مساجد کے اندر ہونے والی تعلیمی سرگرمیوں کی رپورٹ اسے باقاعدگی سے ملتی تھی۔ یہ کام اس کے ہمدرد' تنخواہ دار' خیر خواہ انجام دیتے تھے جن کا بظاہر علماء اور طلبہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فرانس دینی تعلیم کی سرگرمیوں کو اپنے تسلط کے خلاف خطرہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ 18 فروری 1933ء کو الجزائر کے گورنر نے ایک حکم نامہ جاری کیا' جس کے تحت علماء کرام کو کسی بھی قسم کی تعلیمی سرگرمیاں مسجدوں میں جاری رکھنے سے روک دیا گیا۔ حکم میں علماء کو انتشار پسند' تخریب کار اور دہشت گرد کے طور پر پیش کیا گیا' اور کہا گیا کہ وہ غیر ملکی عربوں اور مسلم ممالک کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ علماء نے اس سرکاری حکم پر سخت احتجاج کیا اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ حکومت فرانس' الجزائر کے گورنر جنرل اور وزیر داخلہ سے دو مطالبے کئے گئے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ان مساجد کو فی الفور کھولا جائے جن کو تالا لگا دیا گیا ہے اور جہاں تعلیم وتدریس خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ الجزائر کے علماء کو خود قرآنی سکول کھولنے کی عام اجازت دی جائے۔ علماء کو یہ حق دیا جائے کہ وہ عوام کو اسلامی اصولوں کے مطابق تعلیم دے سکیں اور ان کی تربیت کر سکیں' اور اس کے لئے مسجدوں کو مرکز کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ فرانس کے صدر کو ایک یادداشت پیش کی گئی' جس میں کہا گیا کہ مسجدوں کی بندش منظور نہیں کی جا سکتی جہاں لوگوں کو اپنے دین کی تعلیم دینے سے روک دیا گیا ہے' یہ

نوے لاکھ مسلمانوں کا بنیادی حق ہے جسے سلب نہیں کیا جا سکتا۔

1935ء میں ''جمعیت العلماء الجزائر'' کی جنرل اسمبلی میں احمد بن بادیس نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں پر مساجد کے دروازے بند کرنا انتہائی اشتعال انگیز اقدام ہے' جمعیت ہرگز اس اقدام کو قبول نہیں کرے گی اور اس حکم کے خلاف زبردست جدوجہد کی جائے گی۔ انہوں نے علمائے کرام کی طرف سے کہا کہ میں اعلیٰ حکام پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس مذہبی پابندی پر احتجاج کرتے ہیں۔ حکومت فرانس نے کسی مطالبے کو تسلیم نہیں کیا' لیکن عوام نے زبردست پذیرائی بخشی۔ جب 1933ء میں مسجدوں کی بندش کا حکم جاری ہوا تھا اسی سال عوام نے ازخود 90 کے قریب نئی مساجد قائم کر لیں۔ علماء کی تعداد کم تھی' اس لئے جمعیت نے فیصلہ کیا کہ علماء ہر وقت متحرک رہیں گے اور ان مساجد میں کمی کو پورا کرتے رہیں گے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جائیں گے اور مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ مسلمان اس موقع کی تلاش اور انتظار میں رہتے۔ جب کسی عالم دین کو اُن کے علاقے میں آنا ہوتا اس کا شاندار استقبال کیا جاتا۔ وہ کھلے میدانوں میں جمع ہو جاتے اور آنے والے مہمانوں کی تقریریں غور اور توجہ سے سنتے اور فرانسیسی سامراج کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے۔ حکومتِ فرانس نے ایک بار پھر مداخلت کی اور الجزائر میں علماء کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی۔ ہر عالم دین کو پابند کر دیا گیا کہ وہ اپنے شہر یا قصبے سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی مسجد میں تعلیم و تبلیغ نہیں کر سکتا۔ علماء کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ اگر اسے اپنے کسی قریبی رشتہ دار کی وفات پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے لئے باقاعدہ اجازت طلب کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اکثر معاملات میں یہ خصوصی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا جاتا۔

علماء کے کلب

مسجدیں مسلمانوں اور علمائے دین کے لئے مقفل کر دی گئیں تو علماء نے ایک انوکھا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے نوجوانوں کو راغب کرنے کے لئے سماجی کلب قائم کئے۔ ان کلبوں میں لیکچر کا اہتمام کیا جاتا اور نوجوانوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ وہ اس لیکچر پر سوال و جواب اور مباحثے میں شریک ہوں۔ سٹڈی سرکل کی طرز پر اس بحث سے تعلیم کا کام لیا جاتا تھا۔ ان کلبوں کو تین درجوں میں منظم کیا گیا' بچوں کے کلب' نوجوانوں اور طلبہ کے کلب اور پختہ عمر کے افراد کے کلب۔ فرانسیسی تہذیب کے زیر اثر نوجوان نسل میں نائٹ کلبوں کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا' جہاں قمار بازی کے ساتھ ساتھ دوسری تمام برائیاں بھی موجود تھیں۔ حکومت ایسے نائٹ کلب کھولنے کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ ان نائٹ کلبوں کے ردِعمل کے طور پر علماء نے سماجی کلب قائم کئے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد یہ بتایا گیا کہ ان کے ذریعے نوجوان نسل کو تربیت فراہم کی جائے گی۔ سماجی کلبوں کی تشکیل اس طرز پر کی گئی تھی کہ وہ مساجد اور مدارس کی کمی کو پورا کر سکیں۔ علماء کو بخوبی علم تھا کہ ایک شرابی اور جواری نسل کی تیاری کے

ذریعے فرانس ان کا مستقبل برباد کرنا چاہتا ہے' اس لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو بلوغت اور شباب کی ممکنہ برائیوں سے بچایا جا سکے اور ان کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی پر خاص توجہ دی جائے۔ انہوں نے نئی نسل کو یہ درس دیا کہ وہ خود کو اُمت مسلمہ کی قیادت کے لئے تیار کرے۔ ان سماجی کلبوں میں نوجوانوں کو فرانسیسی قبضے سے پیدا شدہ نازک صورتِ حال اور اس کے نقصانات سے بخوبی آگاہ کیا جاتا۔ ان کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی اسلامی اور عربی تہذیب کے تحفظ کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

بالآخر علماء کو چند شرائط کے ساتھ سکول قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء کے ان مدرسوں میں طلبہ کو قرآن و حدیث اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی' عربی زبان کی اہمیت بتائی جاتی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں مروّجہ علوم سیکھنے کے لئے طلبہ کو تیار کیا جاتا تھا۔ اسلام سے گہری وابستگی اور اس کے بارے میں بنیادی باتوں کا علم حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ عربی زبان سے پوری واقفیت ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی زبان کو محفوظ کر کے ہی روحِ اسلام کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ علماء چونکہ پیشے کے اعتبار سے ''ٹیچر'' ہوتے تھے اس لئے وہ درس و تدریس کی بنیادی ضرورتوں کو خوب سمجھتے تھے' اور یہ بھی جانتے تھے کہ حکومتِ وقت ان کے راستے میں نت نئی رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی ہے' لہٰذا وہ اپنی دوہری ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے تھے۔

علماء کے قائم کردہ سکولوں کو ''جمعیت العلماء الجزائر'' کے نظم کے تحت مربوط کیا گیا۔ ذہین اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے طلبہ کو جامعہ ازہر اور دوسری جامعات میں بھیجنے کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں تیونس کی جامعہ زیتون سے خصوصی استفادہ کیا گیا۔ علماء کو اس امر کا بھی شدت سے احساس تھا کہ طلبہ کا رابطہ عربی زبان و تہذیب سے ٹوٹنے نہ پائے۔ انہوں نے مفت تعلیم کا بھی بندوبست کیا' تاکہ الجزائر کا ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے۔ 1948ء میں جمعیت کے زیر اہتمام 140 پرائمری سکول کام کر رہے تھے۔ اُسی سال ثانوی تعلیم کے ادارے بھی قائم کئے گئے۔ پہلا ثانوی سکول ''انسٹی ٹیوٹ آف ابن بادیس'' کے نام سے قائم کیا گیا جسے الجزائر میں مسلمانوں کی تعلیم کا ایک سنگ میل قرار دیا جاتا ہے۔ 1951ء میں اس ادارے میں 702 طلبہ زیر تعلیم تھے' جبکہ 1955ء میں یہ تعداد 903 ہو گئی۔ 1956ء میں 40 طلبہ اپنی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس ادارے کی طرز پر دوسرے شہروں میں بھی ثانوی تعلیم کے ادارے کھل گئے۔

اب حکومتِ فرانس نے بھی زیادہ سنجیدگی اور سختی کے ساتھ علمائے دین کی تعلیمی سرگرمیوں کی نگرانی شروع کر دی۔ دینی مدارس' جن کو وہاں ''قرآنی سکول'' کہا جاتا تھا' بڑی تیزی سے پورے الجزائر میں پھیل گئے۔ بعض علاقے تو ایسے بھی تھے جہاں دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ نے فرانسیسی فوج میں جبری بھرتی کے خلاف اتحاد کر لیا تھا اور وہ فوج میں خدمات انجام دینے سے صاف انکار کر رہے تھے۔ وہ جبری بھرتی اور فرانسیسی فوج کی ملازمت کو کفر سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ

فرانس جبراً بھرتی کر کے خود اُن کے مسلمان بھائیوں کے خلاف استعمال کرتا ہے' جو کہ سراسر کفر ہے نیز کیمپوں میں رہائش کے دوران بری عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ علماء کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ ان کے زیرِ اثر علاقوں میں طوائفوں کو اپنے اڈے اور نائٹ کلب بند کرنے پڑے۔ وزارتِ داخلہ نے ان حالات کے پیش نظر ایک حکم جاری کیا' جس کی رو سے عربی زبان کو ''غیر ملکی زبان'' قرار دے دیا گیا' علماء کو عربی زبان کی تعلیم و تدریس سے قانوناً روک دیا گیا اور پولیس اور فوج سے کہا گیا کہ وہ اس حکم پر عمل درآمد کرائیں۔ علماء کو سخت دکھ ہوا۔ انہوں نے گورنر جنرل سے باقاعدہ طور پر سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے پیرس میں بھی بے شمار یادداشتیں اور قراردادیں ارسال کیں کہ ایک عرب ملک میں عربی زبان ہی کو غیر ملکی زبان قرار دیا جا رہا ہے۔ حکومت فرانس نے ایک اور حکم نامہ قدرے نرمی سے جاری کیا' جس میں کہا گیا کہ عربی زبان کی تعلیم و تدریس کے لئے علماء کو باقاعدہ اجازت لینا ہوگی' خلاف ورزی کرنے پر علماء کو شدید سزائیں دی جائیں گی۔ علماء نے اس حکم نامے کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' جس پر انہیں قید و بند اور جرمانے کی سزائیں دی گئیں۔ 1949ء میں 27 علماء کے مقدمات صرف دارالحکومت الجزیرہ کی عدالتوں کو بھیجے گئے۔ علماء نے کہا کہ جس طرح فرانس میں فرانسیسی زبان پڑھانے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح الجزائر میں عربی پڑھانے کے لئے کسی قسم کی اجازت نہیں لی جائے گی۔

اس نئے حکم کا شدید ردِعمل ہوا۔ ڈاکٹر' انجینئر' وکیل' غرض ہر شعبے سے وابستہ مسلمان ''جمعیت العلماء'' سے رابطہ کرنے لگے' حالانکہ وہ عالم تھے اور نہ انہیں عربی آتی تھی۔ لیکن وہ علماء کے ساتھ احتجاجی تحریک میں شامل ہو گئے۔ تحریک میں ان لوگوں کی شمولیت کے بعد احمد بن بادیس نے ایک بیان میں کہا کہ کچھ سرکاری لوگ سمجھتے تھے کہ اسلام اور عربی صرف علماء کرام کا مسئلہ ہے' لیکن عوام کے تمام طبقوں کی زبردست حمایت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سارے الجزائر کا مسئلہ ہے۔ اب یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے کہ یورپ اور فرانس میں تعلیم پانے والے الجزائری اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اسلام اور عربی زبان کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں۔

علمائے کرام کی جدوجہد کا نقطۂ عروج اُن کے تین بنیادی مطالبات تھے۔ عربی زبان کی تعلیم و تدریس' مساجد میں تعلیم و تدریس کی آزادی اور غیر ملکی قوانین کی برابری کے ساتھ اسلامی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے معاملات فیصل کئے جائیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تمام سختیوں' رکاوٹوں اور پابندیوں کے باوجود الجزائر اسلامی تہذیب کے احیاء و تجدید کے راستے پر گامزن رہا اور علمائے کرام کے ولولہ انگیز اور غیر متزلزل کردار نے اسلامی اقدار کے تحفظ اور فروغ' اسلامی تعلیم کی توسیع اور عربی زبان کے تحفظ میں زبردست کردار ادا کیا' ورنہ ممکن تھا کہ عربی کو ہمیشہ کے لئے الجزائر کی سرزمین سے

نکال دیا جاتا۔ لیکن اس مذہبی جنگ میں الجزائر کے کسی ایک مسلمان نے بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ ہر مسلمان مَرد اور عورت علمائے کرام کے شانہ بشانہ احیائے اسلام کے لئے بھی لڑتے رہے اور جنگ آزادی میں بھی تاریخ ساز کردار ادا کرتے رہے۔

الجزائر کا ایٹم بم

الجزائر میں لوکل کونسلوں کے انتخابات کے بعد یورپ نے محسوس کر لیا تھا کہ ''نیشنل لبریشن فرنٹ'' کی حکمرانی کو زوال آ چکا ہے اور اسلام پسند قوتیں ابھر رہی ہیں۔ اس خدشے کے تحت کہ آئندہ پارلیمانی انتخابات میں نیشنل فرنٹ کو شکست ہوگی اور اس کی جگہ اسلامی فرنٹ حکومت بنائے گا' یورپ نے دوسرے اقدامات کے علاوہ ایک باقاعدہ مہم کے تحت الجزائر کو بدنام کرنا شروع کر دیا کہ الجزائر عرب دنیا کا پہلا ایٹم بم بنا رہا ہے۔ اس سازش کا آغاز برطانوی پریس سے ہوا اور پھر امریکی میڈیا کا دل پسند موضوع بننے کے بعد یہ پروپیگنڈا اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ برطانیہ میں اس کا آغاز عربی زبان کے اخبارات کے ذریعے کیا گیا' تاکہ یہ تاثر دیا جائے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے ہیں۔ کہانی یہ گھڑی گئی کہ چین نے الجزائر کو 15 سے 40 میگا واٹ قوت کا ایٹمی پلانٹ دیا ہے جس سے بجلی پیدا نہیں کی جائے گی' کیونکہ بجلی پیدا کرنے کے لئے بہت چھوٹا ہے' لیکن ایٹمی تحقیق کے لئے بہت بڑا اور مناسب ہے۔ اخبار ''الشرق الاوسط'' کی یکم مئی 1991ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ الجزائر نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس نے ایک ایٹمی ری ایکٹر بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے' تاہم وہ مغرب کے خدشات دُور کرنے کے لئے تیار ہے۔ الجزائر کی حکومت ''ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی'' کو اپنے ایٹمی پروگرام کی تمام معلومات وتفصیلات سے آگاہ کرنے کے لئے تیار ہے اور معائنے سے بھی انکار نہیں کرے گی۔

حقیقت یہ تھی کہ چین اور الجزائر نے 1988ء میں ایٹمی پلانٹ کے سمجھوتے پر دستخط کئے تھے۔ دارالحکومت الجزیرہ سے 250 کلومیٹر جنوب میں ایک مقام پر اس ری ایکٹر کو نصب کیا جانا تھا۔ اس کی قوت صرف 15 میگا واٹ تھی' اس لئے پُرامن مقاصد کے سوا اس کا دوسرا استعمال ممکن ہی نہیں تھا۔ اس منصوبے کا آغاز حوری بومدین نے کیا تھا جو الجزائر کو علاقے کی طاقت بنانا چاہتے تھے۔ یہ منصوبہ سراسر صنعتی تھا اور اس کا ایٹمی اسلحے کی تیاری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بومدین کی کوشش تھی کہ وہ اپنے ملک کی صنعتی بنیادوں کو مضبوط کر دیں' تاکہ وہ عرب اور افریقی سطح پر اہم کردار ادا کر سکے۔ بومدین نے افریقی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے کے لئے ''افریقی اتحاد کی شاہراہ'' کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ یورپ والوں کا کہنا تھا کہ شاذلی بن جدید نے اس پُرامن مقاصد والے جوہری پروگرام کو فوجی بنا دیا تھا۔ اُن کے دور حکومت میں چین سے ایٹمی ری ایکٹر حاصل کیا گیا۔

مغرب نے اس مسئلے پر الجزائر کی حکومت اور حزبِ اختلاف کو لڑانے کی بھرپور کوشش کی۔

مغربی [redacted] مسلسل پروپیگنڈا کرتا رہا کہ ''اسلامی فرنٹ'' برسراقتدار آ کر ایٹمی صلاحیت کو عسکری مقاصد کے لئے استعمال کرے گا' جبکہ حکومت کو باور کرایا گیا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں امریکی افواج حملہ آور ہوں گی اور بڑا فضائی حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ جنوری 1991ء میں خلیجی جنگ میں اتحادی فضائیہ کے حملوں کو امریکا اور یورپ اب اس طرح استعمال کر رہے تھے جس سے خلیجی ممالک اور مشرق وسطیٰ کے کسی بھی ملک کے فوجی طاقت کے طور پر ابھرنے کا امکان نہ رہے۔ خلیجی جنگ سے قبل 12 جون 1990ء کو الجزائر کو امریکہ کے فضائی حملے کی دھمکی بھی دی گئی۔ سی آئی اے کا کہنا تھا کہ ایٹم بردار الجزائر پورے خطے میں طاقت کا توازن تبدیل کر دے گا۔ اگر یہ صلاحیت ''اسلامی فرنٹ'' کے مذہبی جنونیوں کے ہاتھ آ گئی تو وہ اسے تباہ کن فوجی مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ الجزائر کو برابر یہ خطرہ بھی لاحق رہا کہ اسرائیل نے جس طرح عراق کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا اسی طرح الجزائر کے ایٹمی پروگرام پر بھی حملہ کر سکتا ہے' جبکہ فرانس کے فضائی حملے کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

متحدہ عرب امارات کے اخبارات نے اپنے اداریوں میں بار بار اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ چین سے حاصل کردہ پلانٹ پُرامن مقاصد کے لئے ہے' لیکن مغربی میڈیا نے اس طرح کی یقین دہانی پر اعتبار نہیں کیا۔ اس دوران میں ایک واقعہ ہوا۔ برطانیہ کے فوجی اتاشی کو الجزائر کے ایٹمی پلانٹ کی تصویر اتارتے پکڑ لیا گیا اور اسے فوری طور پر الجزائر چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ قطر کے اخبار ''الاشرق'' نے 30 اپریل 1991ء کی اشاعت میں لکھا کہ الجزائر کے ایٹمی سائنس دانوں کی تعداد 300 ہے اور انہیں سوویت یونین کی مدد اور رہنمائی حاصل ہے۔ اخبار نے یہ بھی لکھا کہ الجزائر نے 1989ء میں ارجنٹائن سے ایک ایٹمی ری ایکٹر حاصل کیا ہے اور اب اس کے پاس تین پلانٹ ہیں۔

دسمبر 1991ء میں پہلے مرحلے کے انتخابات میں ''اسلامی فرنٹ'' کی شاندار کامیابی کے بعد امریکی و یورپی میڈیا نے الجزائر کے ایٹمی پلانٹ پر اعتراضات میں مزید شدت پیدا کر دی اور کہا کہ اس پروگرام سے خطے کے امن کو لاحق خطرات ''اسلامی فرنٹ'' کی حکومت کے آنے سے بہت شدید ہو جائیں گے۔ جب فوج نے ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا تو کچھ ہی دنوں کے بعد مغربی میڈیا نے [redacted] جاری کر دیا کہ الجزائر ایٹم بم نہیں بنا رہا' اس کے پاس اس قسم کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ (گزشتہ سال امریکہ اور برطانیہ نے مل کر ایسا ہی ڈراما عراق میں رچایا تھا۔ میڈیا سے بھرپور پروپیگنڈا کرایا گیا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں' اس لئے حملے کا بہانہ بنایا گیا' اور اب اعتراف کیا جا رہا ہے کہ عراق میں ایسے ہتھیار نہیں تھے)۔

جیسا کہ پچھلی قسط میں بتایا جا چکا ہے' مسلم دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح الجزائری بھی مغربی طاقتوں کے زیر اثر جی رہے ہیں۔ مغربی طاقتیں مقامی فوج کے ذریعے اپنا تسلط جماتی ہیں۔ الجزائر

بھی آئین کی رو سے بظاہر الجمہوریہ ہے' لیکن فی الحقیقت بدترین فوجی آمریت والا مسلم ملک ہے۔ فوجی آمریت کے خلاف جب بھی الجزائر کے عوام کو موقع ملتا ہے احتجاجی تحریک سر اٹھاتی ہے' تحریک گرم ہونے لگتی ہے کہ فوج آگے بڑھ کر اسے ٹھنڈا کر دیتی ہے اور یوں الجزائر کی تاریخ جمود کی برفیلی ٹھنڈک میں ٹھٹھری ہوئی کھڑی ہے۔ الجزائر کی سرزمین اسلام کے احیاء و تجدید کے لئے انتہائی موزوں ہے' مگر احیاء و تجدید کے لئے آزادی اور خود مختاری کی فضا درکار ہوتی ہے جو الجزائریوں کو میسر نہیں ہے۔

آئندہ شمارے میں

''جدید دنیائے اسلام'' کے قسط وار سلسلے کے تحت آئندہ شمارے میں **انڈونیشیا** پر مضمون شائع ہوگا' جبکہ اب تک درج ذیل مسلم ملکوں کے حالات پر مضامین شائع ہو چکے ہیں:

❁ آذربائی جان	جون 2003ء
❁ اردن	اگست 2003ء
❁ ازبکستان	ستمبر 2003ء
❁ افغانستان	اکتوبر + نومبر 2003ء
❁ البانیہ	دسمبر 2003ء
❁ الجزائر	جنوری + فروری + مارچ 2004ء

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ **www.tanzeem.org** پر ملاحظہ کیجئے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

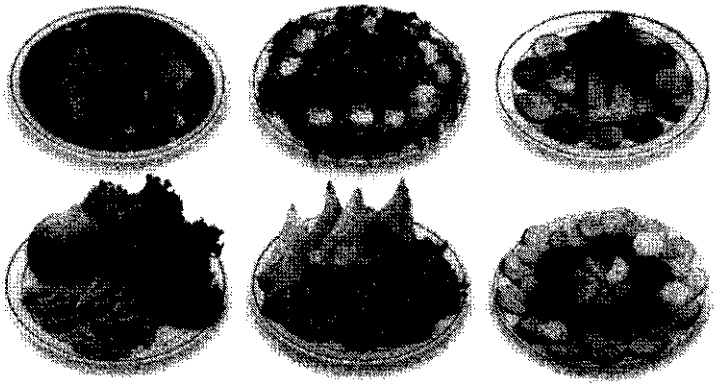

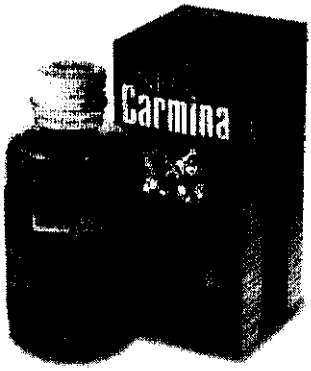

اهم یہ نہیں کہ آپ کیا کھاتے ہیں
بلکہ اہم یہ ہے کہ
آپ کتنا ہضم کرتے ہیں
صحت مند رہنے کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ آپ کیا کھاتے ہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کا معدہ غذا کو صحیح طور پر ہضم کرکے جزو بدن بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔
دائمی قبض، سینے کی جلن، تیزابیت، گیس، پیٹ کا درد، قے یا متلی کی کیفیت اس بات کی علامتیں ہیں کہ آپ کا ہاضمہ درست نہیں۔
کھانے پینے میں احتیاط برتیے، مرغن اور مرچ مسالے دار کھانوں سے پرہیز کیجیے اور پابندی سے نئی کارمینا لیجیے۔
ہمدرد کی نئی کارمینا تیزابیت اور گیس کے مریضوں کے لیے بھی بے ضرر اور یکساں مفید ہے۔
Carmina
خوش ذائقہ نئی کارمینا
ہاضمہ درست، صحت بحال
www.hamdard.com.pk

Adarts-2001